نئی نسل کا معمار اور تعمیر و ترقی کا داعی

ماہنامہ

جلد: ۳۱ | شمارہ: ۴ | اپریل ۲۰۱۸ء | رجب المرجب۔ شعبان المعظم ۱۴۳۹ھ

editor@rafeeqemanzil.com

MANAGER
Bilal Khan 9029194433
managerrmgp@sio-

Asst. MANAGER
Abdul Jabbar 08447622919
asst.managerrmgp@sio-

₹160 سالانہ | ₹15

D-300, Abul Fazl Enclave Jamia Nagar, Okhla New Delhi - 110025 | Tel: 26949817 | Email:managerrmgp@sio-india.org |

Printed on behalf of The Students Islamic O rganisation ofIndia, Printer & Publisher Tanveer Alam, Printed at Bharat Offset, 2034/35, Qasim Jan Street, Ballimaran, Delhi - 110006, Published from 230, Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi - 110025 | **Editor: Mustajab Khatir**

دنیا چھوٹ جانے والی ہے!

ڈاکٹر وقار انور

انکم لتحرسون علی الامارۃ وستکون ندامۃ (وحسرۃ) یوم القیمۃ فنعم المرضعۃ وبئست الفاطمۃ۔ (عن ابی ہریرۃ: السلسلۃ الصحیحۃ، حدیث نمبر ۱۷۴۱)

''عن قریب تم امارت کی حرص کروگے اور عنقریب قیامت کے دن یہ امارت ندامت (اور حسرت) کا باعث ہوگی۔ اس لیے کہ دودھ پلانے والی اچھی ہوتی ہے اور دودھ چھڑانے والی بری''۔

آں حضرتؐ کی یہ حدیث ان احادیث میں شامل ہے، جن میں امارت طلب کر کے حاصل کرنے اور اس کی حرص کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ احادیث کے مطالعے سے یہ بات سمجھ آتی ہے کہ دیگر ذمہ داریوں کی طرح امارت، حکومت، سربراہی اور اقتدار کے لالچ سے ہر شخص کو دور رہنا چاہیے۔ کیوں کہ یہ فتنے ہیں جو دنیا اور آخرت میں تباہی کا باعث بن سکتے ہیں۔ کوئی ذمہ داری مل جائے اور اس کے مطابق کام کرنے کی صلاحیت کوئی شخص اپنے اندر پاتا ہو تو اسے قبول کرسکتا ہے، لیکن اگر وہ صلاحیت نہ رکھتا ہو تو صاف صاف معذرت کرلینی چاہیے۔

اقتدار حاصل ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ ایسا شخص اپنے ذاتی اعمال کے ساتھ ساتھ دیگر افراد جن کی سربراہی اسے حاصل ہے کہ معاملات کے لیے بھی جواب دہ ہوجائے۔ ایک مشہور حدیث میں ہے کہ ہر راعی (ذمہ دار) سے اس کی رعیت (ماتحتوں) کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ ایک اور حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ اگر اس جواب طلبی میں راعی دغاباز ٹھہرا تو اس کا انجام جہنم ہوگا۔ [ایما راع استرعی رعیۃ فغشھا فھو فی النار۔ السلسلۃ الصحیحۃ، حدیث نمبر ۱۷۵۰]

درج بالا حدیث میں امارت کی حرص کا نتیجہ قیامت کے دن ندامت اور حسرت بتایا گیا ہے۔ قیامت کے دن یہ ذمہ داران اپنے معمورین کے سامنے اس طرح پیش کردیے جائیں گے کہ اس کا سارا اقتدار ختم ہوچکا ہوگا اور وہ بے بس ہوکر بندگان خدا کے سامنے شرم سار ہو رہا ہوگا اور اس بات کی حسرت ہوگی کہ کاش وہ زمین پر اپنے دور حیات میں امارت کی حرص سے بچا ہوتا۔

زمین پر حاصل ہونے والا اقتدار ہمیشہ باقی نہیں رہتا۔ اکثر دنیا کی زندگی میں ہی وہ اقتدار چھن جاتا ہے اور اگر ایسا نہیں تو موت کے بعد کی سزا تو ہر شخص کو چکھنا ہی ہے۔ سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ۔ متذکرہ حدیث میں دور اقتدار کی ان فانی لذتوں اور پھر ان سے محروم ہوجانے کو ایک مثال کے ذریعہ سمجھایا گیا ہے۔ گود کے بچے کا وہ زمانہ جب اسے اس کی والدہ یا کوئی اور دودھ پلانے والی خاتون دودھ پلا رہی ہوتی ہے، اس کے لیے وہ بہت مزہ کا ہوتا ہے۔ لیکن ایک وقت ایسا بھی آتا ہے، جب اس کا دودھ چھڑایا جاتا ہے، اسے وہ وقت جتنا بھی ناگوار ہو اس کا دودھ چھڑا دیا جاتا ہے۔ یعنی دودھ پلایا جانا کتنا اچھا ہوتا ہے اور اس کا چھڑایا جانا کتنا برا۔ اس مثال کی طرح اگر ہم اقتدار اور دیگر لذتیں فراہم کرنے والی دنیا کو دودھ پلانے والی خاتون کی طرح سمجھ لیں تو ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ جو کچھ اس دنیا میں حاصل ہو رہا ہے، اسے ایک وقت ختم ہوجانا ہے اور ہمارے سب مال واسباب اور دیگر بندگان خدا پر ہماری سربراہی چھین لی جائے گی اور اس وقت اس بات کا کوئی لحاظ نہیں کیا جائے گا کہ ایسا ہونا ہمیں پسند ہے یا ناپسند۔

اس حدیث میں یہ بات بھی بتائی گئی ہے کہ امارت کی طلب کے اس غلط عمل میں امت مسلمہ مبتلاء ہونے والی ہے۔ ہم اپنے زمانے میں نظر اٹھا کر دیکھتے ہیں تو پاتے ہیں آں حضرتؐ کی یہ پیشین گوئی کتنی درست ہے۔ اس لیے درست رویہ یہی ہے کہ ہر اس کام میں بشمول امارت کی حرص سے بچا جائے جو قیامت کے دن خدا اور بندگان خدا کے سامنے ندامت اور اپنی دنیا کی سابقہ زندگی کے طرز عمل کے سلسلے میں حسرت کا باعث بنے۔

بابری مسجد کی تحقیقات اور بے خبری کا عالم

مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں مسجد کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی صورت گری کرنے والے جملہ امور مسجد میں طئے پاتے ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں کی زندگی میں معنویت کو داخل کرنے کا کام مسجد ہی سے انجام پاتا ہے۔ احادیث میں مسجد سے دل لگانے والے اور مسجد کی نگہبانی اور خدمت کرنے والے کے ایمان کے بارے میں بڑی بشارتوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس لئے گویا یہ تقاضائے ایمانی ہے کہ ہر مسلمان مسجد سے اپنے آپ کو جوڑے رکھے۔

مسجد کی یہ حیثیت کے علی الرغم یہ بات شریعت پورے زور وشور سے کہتی ہے کہ اصل چیز انصاف ہے۔ اس لئے غصب شدہ زمین پر اور ناجائز مال سے مسجد کی تعمیر درست نہیں۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر شریعت کا حکم ہے کہ اگر کوئی مسجد غصب شدہ زمین پر تعمیر کی جاتی ہے تو اسے گرادیا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں سے اہل ثروت ہوں یا فقراء، انہوں نے مسجد کی تعمیر کے سلسلے میں شریعت کی اس تعلیم کا بجا طور پر لحاظ رکھا ہے۔ خود اللہ کے رسولؐ نے مسجد نبوی کی زمین کو ہدیہ میں قبول کرنے کے بجائے قیمت ادا کر کے اسے مسجد کی تحویل میں دینے کی مثال ہمارے سامنے رکھی ہے۔

ان دونوں باتوں سے ہٹ کر یہ بات ہم جانتے ہیں ہندوستان میں دیگر کئی علاقوں میں بہت سے مندر اور گرجے آج مسجد کی صورت میں موجود ہیں۔ ہندو، یہودی اور عیسائی عوام نے جب جوق در جوق اسلام قبول کیا تو ان کی عبادت گاہیں بھی اسلام کے دامن میں گر گئیں اور شرک کے مراکز کی جگہ اللہ کی کبریائی بیان کرنے والی مساجد نے لے لی۔ چھوٹے چھوٹے گاؤں میں آپ کو کئی ایسی مساجد مل جائیں گی، جن میں ہندوی طرز تعمیر کے نقوش ملتے ہیں۔ کئی ایسے بوڑھے مل جائیں گے جنھوں نے مندروں اور پجاریوں کو مسجدوں اور اماموں میں تبدیل ہوتے دیکھا ہے۔ یہ تبدیلی ایک ایسی تبدیلی ہے جو کہ جبر وکراہت کے ساتھ نہیں لائی جاسکتی۔ اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان مسجدوں کی تعمیر غصب کی زمین پر نہیں بلکہ پجاریوں اور عوام کی مرضی کے تحت عمل میں لائی گئی۔

رام ایک افسانوی کردار ہے۔ تو اس کا پیدا ہونا بھی ایک افسانہ ہے۔ اس کی جائے پیدائش بھی ایک افسانہ ہی ہونی چاہئے۔ لیکن مت ماری گئی ان بت پرستوں کی جو یہ سمجھتے ہیں کہ ایک افسانوی کردار بالحقیقت پیدا بھی ہوسکتا ہے۔ تخیل سے سفر کرتے ہوئے حقیقت کی دنیا میں بھی واقع ہوسکتا ہے۔ اگر ان کی بات درست ہے تو ہیری پاٹر کا گھر 4، پرائیویٹ ڈرائیو، سرّی میں اور شرلاک ہومس کا گھر 221B بیکر اسٹریٹ لنڈن میں ہے۔ کیا ہوگا اگر ہیری پاٹر کے ماننے والے اور شرلاک ہومس کے پیروکار عدالت میں مقدمہ دائر کردیں کہ ان گھروں کے اصل مالکان کو نکال باہر کر کے انہیں ان کی آستھا کی بنیاد پر ان علاقوں کی ملکیت دے دی جائے؟ بالکل اسی طرح رام بھکتوں کا یہ مطالبہ کہ ان کی آستھا کی بنیاد پر انہیں مسجد کو گرا کر رام کی پوجا کرنے کی سہولت دی جائے۔ کسی صورت میں یہ مطالبہ معقول نہیں ہے۔ اور نہ ہی حق وانصاف پر مبنی ہے۔

ہندوستان کی عدالت عظمیٰ گو کہ ایک قابل عزت ادارہ ہے لیکن یہ عیب سے پاک نہیں ہے۔ اس ادارہ کے اعلیٰ ترین ذمہ داران رشوت خوری، بزدلی، تعصّبات اور میڈیا وحکومت کے دباؤ کے تحت فیصلے سناتے آئے ہیں۔ اس بات کو ثابت کرنے کے لئے متعدد مقامات پر آپ کو شواہد مل جائیں گے۔ مطلب یہ کہ جہاں عدالت عظمیٰ سے ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ درست فیصلہ سنائے گی وہیں اس بات کا امکان بھی ہے کہ بہت سی معمولی وجوہات کو بنیاد بنا کر عدالت ویسا ہی احمقانہ فیصلہ سنائے جو کہ الہ آباد کورٹ نے سنایا تھا، بلکہ اسے بھی آگے بڑھ کر کوئی اور ظالمانہ فیصلہ بھی سنادے۔ اس لئے ہمیں بہرحال ہر قسم کے فیصلہ کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ اس امید پر کہ سارے شواہد مسجد ہی کے حق میں ہیں اس لئے مسجد وہیں قائم رہے گی، یہ کوئی یقینی بات نہیں ہے۔

محکمۂ آثار قدیمہ نے بابری مسجد کے نیچے جو کھدائی کی ہے اور 'شواہد' فراہم کئے ہیں وہ تمام شواہد جھوٹے ہیں۔ کئی ذریعوں سے اس بات کی تصدیق کی جاسکتی ہے۔ عدالت جب فیصلہ سنائے گی تو ان ہی شواہد کی بنیاد پر سنائے گی۔ اسی لئے متعصب ذمہ داران اور 'ماہرین' کا استعمال کر کے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے کہ فی الاصل بابری مسجد کے نیچے کوئی مندر تھا۔ لیکن ان جھوٹے ثبوتوں کو جھوٹا ثابت کرنا اب ایک مشکل کام ہوگیا ہے۔ اس پوری صورت حال کو سمجھنا اور آئندہ پیدا ہونے والی پیچیدہ صورتحال کا محاکمہ کرنا بے حد ضروری ہے۔ اس شمارہ میں ہم نے ایک تحقیق کو پیش کیا ہے جو کہ ان ثبوتوں کے جھوٹ اور ملاوٹ کو ثابت کرتی ہے۔ جہاں ایسی مزید تحقیقات درکار ہیں وہیں موجودہ تحقیقات کی بنیاد پر ایک مضبوط تحریک کھڑی کرنے کی ضرورت ہے جس کے ذریعے عدالت کو مجبور کیا جاسکے کہ وہ گھڑ دئے جانے والے ثبوتوں کو رد کرے اور ازسرنو غیر جانب دارانہ تحقیقات کرے۔

مسلم قیادتیں ماضی کی طرح اب بھی توڑ جوڑ کی سیاست میں گرم ہیں۔ اور نہ ہی کوئی ادارہ، نہ کوئی جماعت، نہ کوئی نیتا اور نہ ہی کوئی خود ساختہ نمائندہ اس اہم مسئلہ پر کوئی نظر رکھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس معاملہ کو بڑی آسانی کے ساتھ ثبوتوں اور شہادتوں کی بنیاد پر حل کیا جاسکتا تھا۔ لیکن مسلمانوں کی کوئی جماعت اس قسم کا کوئی ٹھوس ریسرچ کرنے کے مؤقف میں نظر نہیں آتی۔ اس لئے اگر بابری مسجد سے متعلق کوئی ظالمانہ فیصلہ سامنے آجائے تو ہمیں براہ راست مسلم جماعتوں، اداروں اور علماء کو اس کا ذمہ دار ٹھہرانا چاہیے۔

کوبرا پوسٹ : اسٹنگ آپریشن 136

مادہ پرستانہ سرمایہ داریت کا یہ عہد ایک کرپشن گزیدہ عہد ثابت ہوا ہے۔ انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی ادارے، تضاد اور بدعنوانی ہی اس عہد کی سب بڑی سچائی معلوم ہوتی ہے۔ وطن عزیز ہندوستان میں سرمایہ دار، سیاست داں اور صحافتی اداروں کی شکل میں ظلم، فریب اور بدعنوانی کا ایک شیطانی مثلث وجود میں آچکا ہے۔ یہ مثلث نہ صرف انسانی اخلاقیات بلکہ مسلمہ پیشہ ورانہ اقدار کی دھجیاں بکھیر رہا ہے۔ ہندوستان میں میدان صحافت میں بدعنوانی، بطور خاص پیڈ نیوز (Paid News) کوئی ڈھکی اور چھپی بات نہیں بلکہ لکھی اور چھپی ہوئی بات ہے۔ برسر اقتدار سیاسی پارٹی کے اقتدار میں آنے کے بعد سے میڈیا کی کارکردگی میں جو گراوٹ آئی ہے اس پر ملک کے ایک محدود حلقے میں مستقل گفتگو ہوتی رہی ہے۔ الیکٹرانک میڈیا میں صحافی حضرات کے رول کو دیکھ کر ایک عام ناظر کے لئے بھی یہ سمجھنا کچھ مشکل نہ تھا کہ صحافی، صحافی کم اور ایک مخصوص نظریہ رکھنے والی سیاسی پارٹی کے ترجمان زیادہ ہیں۔ جسے معروف صحافی رویش کمار نے 'گودی میڈیا' کا مناسب نام دیا ہے۔

میڈیا کے معیار کارکردگی میں گراوٹ پر اب تک جو گفتگو ہوتی تھی وہ زیادہ تر اس حوالے سے ہوتی تھی کہ میڈیا ایشیو کو نان ایشیو اور نان ایشیو کو ایشیو بنا کر پیش کرتا ہے۔ میڈیا نے حقیقی مسائل سے متعلق سوالات کھڑے کرنا اور اہل اقتدار کا احتساب کرنا بند کر دیا ہے۔ میڈیا جانب دار ہو کر رہ گیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ پیڈ نیوز سے متعلق بھی سرسری گفتگو اشارے اور کنائے کی زبان میں ہوتی تھی البتہ اس ضمن میں حقائق پر مبنی پختہ ثبوت کسی کے پاس نہیں تھے۔ لیکن گزشتہ 26 مارچ بروز پیر کو تفتیشی ادارے 'کوبرا پوسٹ' (Cobrapost) نے ملک کے سات ٹی وی نیوز چینلز، چھ اخبارات اور تین ویب پورٹلس کے نمائندوں کے خلاف 'اسٹنگ آپریشن-136' کر کے ملکی صحافت میں پیڈ نیوز کا گھناؤنا چہرہ بے نقاب کر کے ایک تہلکہ مچا دیا اور یوں میڈیا سے متعلق جاری مباحثوں کو ایک نیا رخ دے دیا۔ اس آپریشن میں کوبرا پوسٹ کے پشپ شرما نے آچاریہ چھتر پال کے بھیس میں مختلف صحافتی اداروں کے ذمہ داروں سے بات چیت کر کے یہ دھماکہ خیز انکشاف کیا ہے کہ کیسے یہ صحافتی ادارے چھ کروڑ سے لے کر پچاس کروڑ روپے کے عوض 'ہندتوا' نظریے کی تبلیغ اور سماج میں فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے کے لئے بلاکسی ادنی تامل آمادہ کار رہیں۔ اس اسٹنگ آپریشن کی مکمل تفصیلات یوٹیوب پر ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

ذرائع ابلاغ جمہوریت کا چوتھا سکون ہوا کرتے تھے۔ حقائق یہ بتا رہے ہیں کہ یہ ستون دن بدن کمزور ہوتا چلا گیا ہے۔ موجودہ عہد میں جسے Post-Truth Era کہا جا رہا ہے، جہاں حقیقت اور سچائی ایک قدر اضافی قرار دی گئی ہے، پیڈ نیوز کی روک تھام اور ذرائع ابلاغ کی دنیا میں اصلاحات حکومتی سطح پر ہی ممکن تھیں۔ لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا کہ حکومتیں خواہ کسی سیاسی پارٹی کی ہوں، خود ایک خطرناک مثلث کا حصہ ہیں۔ وہ حکومتیں جو سرمایہ داروں کے عطیات اور ذرائع ابلاغ کے پروپگنڈوں کے بل بوتے برسر اقتدار آئی ہیں ان سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اس میدان میں کوئی اصلاحی اقدام کریں گی۔

ہنسی آتی ہے تیری سادگی پر

تکنالوجی کے اس جدید دور میں جبکہ صرف ایک انگوٹھے کے نشان پر آپ کی کئی پشتوں کی معلومات محفوظ ہوں، آپ کے سارے اسرار قید ہوں اور آپ کو پتہ چلے کہ ہر چوتھے ایرے غیرے نتھو خیرے کی ان معلومات تک رسائی ہے تو آپ کس حد تک خود کو چغد محسوس کریں گے؟ لوگ آنکھیں موند کر امید، سخت محبت اور محنت سے کسی سیاسی پارٹی کو ذاتی و اجتماعی مفاد کے پیش نظر آسمان کی بلندیوں تک اٹھاتے ہیں اور اقتدار میں آتے ہی وہ سیاسی پارٹی آپ کی ذاتی و نجی معلومات حتیٰ کہ آپ کو ہی بیچ کر مزید مضبوط ہونا چاہتی ہو۔ اب آپ ہنستے ہیں تو رونا اور روتے ہیں تو ہنسنا آتا ہے، کیونکہ آپ ماموں بن چکے ہوتے ہیں۔۔۔!

آپ کے معصوم فہم و ادراک سے کہیں بہت دور، کسی سماجی روابط عامہ سائنٹس کے مالکان سے انتخابی پارٹیوں کے سودے ہوتے ہیں۔ آپ کی نجی معلومات کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ ان معلومات کی مدد سے آپ کی ذہن سازی کی جاتی ہے۔ ایک جھوٹی تشہیر و جھوٹی شہرت کا جال بچھایا جاتا ہے۔ پھر آپ میں سے کچھ مرعوب ہو کر اور کچھ نا سمجھ میں آنے والے طریقوں سے اس میں پھنس جاتے ہیں۔ پھر فاتح اور شکست خوردہ پارٹیاں ایک دوسرے پر الزامات عائد کرتی ہیں۔ دھمکیوں کے تبادلے ہوتے ہیں۔ بحث و مباحثے ہوتے ہیں۔ اور آپ الوؤں کی طرح کبھی اس کی شکل دیکھتے ہیں تو کبھی اس کی صورت تکتے ہیں اور چغد بخش محسوس کرتے ہیں! الغرض یہ ایک بہت ہی بڑا اور پیچیدہ سیاسی چکر ہے اور آج کل سائنس کے آبی چکر سے کہیں زیادہ مقبول عام۔

ابھی حال ہی میں نو ججوں کی ایک بنچ نے یک طرفہ متفقہ فیصلہ سنایا کہ آپ کی نجی معلومات کی پوشیدگی اور حفاظت آپ کا بنیادی اور آئینی حق ہے۔ ادھر آپ نے اس جملے سے مطمئن ہو کر راحت اور سکون کا سانس لیا اور ادھر سیاسی کھلاڑیوں اور نجی کمپنیوں کے مالکان نے آپ کو دیکھتے ہوئے ایک لمبی مسکان بھری؛ ہنسی آتی ہے تیری سادگی پر؛ سیاست کی ایک بہت بڑی بساط پر آپ ایک معمولی مہرہ ہیں اور نا جانتے ہوئے بھی اس گھناؤنے کھیل کا حصہ!

بی جے پی کہتی ہے کہ کانگریس چور ہے، کانگریس کہتی ہے کہ بی جے پی چور ہے۔ جبکہ اپنا یہ ایمان ہے کہ دونوں ہی حقیقت پسند اور سچی ہیں۔ ان دو قزاقوں کی جنگ میں مسیحا کا مکھوٹا لیے ایک شخص اروند کیجریوال نمودار ہوا۔ دعویٰ کیا کہ وہ ان سب مفاد پرستوں کا راز فاش کرے گا، رشوت و کالا بازاری میں ملوث سبھی سیاسی اداکاروں کی نیند حرام کر دے گا۔ لیکن جلد ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس نے فرداً فرداً معافی بھی طلب کی۔۔۔

آپ کے نیتا نے کہا سب کے اڑیں گے پرزے ‏ ‏ ‏ ‏ دیکھنے ہم بھی گئے تھے، پہ تماشا نا ہوا

قارئین اپنے تاثرات، مشورے اور تجاویز ارسال کریں۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

بڑی فرحت و مسرت کی بات ہے کہ ہر بار کی طرح اس بار بھی ماہ فروری کا رفیق منزل ملا بغور مطالعہ کے بعد یہ محسوس ہوا کہ ہر ماہ کے مجلّے کی طرح اس ماہ کا مجلہ بھی قابل تعریف و تحسین ہے۔ مجلّے کے جملہ مضامین اپنے اندر مکمل کتاب کا معنی و مفہوم سموئے ہوئے ہیں۔ خاص طور پر نوجوانوں کے اندر پائی جانے والی مذموم برائی خودکشی جس پر عبرت صدیقی نے بھی تبصرہ کیا ہے کہ ''خودکشی جرم بھی ہے صبر کی توہین بھی ہے'' کے موضوع پر کئی مضامین سامنے آئے ہیں۔ ان مضامین میں نہ صرف خودکشی کے اسباب بیان کیے گئے ہیں بلکہ اس سے بچنے کا لائحہ عمل اور ایسے حالات میں ہم طلبہ و نوجوانوں کی ذمہ داری کو بھی مدلل انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس موقع پر میں رفیق منزل کے پورے ادارہ اور اس کے ممبران کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آئندہ بھی اس طرح کے سماجی و معاشرتی مسائل زیر بحث آتے رہیں گے تاکہ لوگوں کے اس گروہ کو جو اپنے ذاتی مسائل سے تنگ آکر ایسے جرائم کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں انہیں اس سے بچایا جاسکے۔ ساتھ ہی میری یہ گزارش ہے کہ مضمون نگار کے نام کے ساتھ اس کا فون نمبر یا ای میل آئی ڈی بھی دی جائے تاکہ ان سے رابطہ ممکن ہو سکے۔

سفیر عالم، مصباح العلوم، چوکونیاں

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ماہ مارچ کا شمارہ ملا۔ فروری کے اعلان کے مطابق شمارہ سائنسی تحقیقات اور اسکی اہمیت اور بحیثیت خدمت دین کے مضامین پر مشتمل تھا لیکن اعلان کے مطابق مسلم طلبا کے لئے مواقع، ھندوستان میں اسکا ماضی حال و مستقبل اور مختلف حکومتی ادارہ جات ان تک رسائی نیز حکومتی اسکیمات مضامین کی کمی محسوس ہوئی اگر یہ شامل ہو جاتے تو شمارہ کو چار چاند لگ جاتے لیکن رفیق کے ذمہ داران لائق ستائش ہیں کہ انہوں نے اس موضوع کا انتخاب کیا اور اسکی جانب طلبا کو راغب کرنے کی اہمیت محسوس کی۔ ظاہر ہیکہ ملت میں ان میدانوں میں کام کرنے والے کمیاب ہیں تو اردو میں لکھنے والے نایاب ہیں لیکن ان نامساعد حالات میں بھی جو مضامین شائع ہوئے اسکے لئے ذمہ داران و مضامین نگار قابل مبارکباد ہیں۔ خاص طور سے ڈاکٹر محمد رفعت صاحب کا مضمون اور ڈاکٹر عتیق الرحمن صاحب کے مضامین پسند آئے۔ ڈاکٹر اسلم پرویز صاحب کا انٹرویو ہمت افزاء تھا دیگر مضامین حسب معیار رفیق اچھے تھے۔ اللہ کرے کہ طلبا و نوجوان اس رسالہ سے خوب فائدہ اٹھائیں۔ اللہ رفیق کی ٹیم کی صلاحیتوں میں اضافہ کرے اور انہیں اجر سے نوازے۔ آمین

عبدالملک شارق نظام آباد

ماہ مارچ کا رفیق منزل دیکھنا اور پڑھنا نصیب ہوا۔ رفیق منزل کی خاصیت یہ ہے کہ اس کو پڑھنے کے بعد اس سے تعلق اور بڑھ جاتا ہے شاید ہی ایسا کوئی رسالہ ہو جو دور جدید میں اسلام کی آبیاری وآبپاشی زمانے سے ہم آہنگ ہو کر کرتا ہو۔ ماہ مارچ کے شمارے میں موجودہ مسائل پر گفتگو اس کے تدارک اور حل پر بہترین مواد ہے، آج امت مسلمہ امت مرحومہ بنتی جارہی ہے اس کی ایک بڑی وجہ یہی ہے کہ اس نے لازوال اور لافانی دستور حیات کو فرسودگی کے قالب میں بند کر دیا ہے جب کہ اس دستور نے پتھر دل کو موم کیا ہے اور حالات و کوائف سے نبرد آزما ہو کر زندگی کی صحیح سمت متعین کی ہے اور ہر دور میں لوگوں نے اس سے موتی و گہر اخذ کیے ہیں۔ الغرض پیش نظر شمارہ اس شوریدگی کو دور کرنے اور نوجوانوں کے دل میں مہمیز لگانے، ان کو بیدار کرنے اور ان کی صحیح خطوط پر رہنمائی کے لیے بہترین مواد فراہم کرتا ہے۔ اس شمارے میں سائنسی تحقیق پر ایک بہترین گفتگو ہے ڈاکٹر محمد رفعت صاحب نے بہت ہی پر لطف انداز میں مسلمانوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ باور کیا ہے کہ اسلام پورے نظام ہائے زندگی پر محیط ہے اور اس کائنات کی ہر چیز پر غور فکر کرنا اور اس کے نتیجے میں ربوبیت اور وحدانیت کا تصور دل میں جاگزیں کرنا ہی اسلام کا اصل منشاء ہے مزید براں یہ کہ اس دنیا میں انسان کی سائنسی اور اسلامی لحاظ سے کیا حیثیت ہے اس کے اختیارات کی حد بندیاں کیا ہیں اور کس طرح سے وہ اس کا صحیح اور بہتر طور پر استعمال کر سکتا ہے جو دنیا اور آخرت میں فلاح و کامرانی کا ضامن بن سکے۔ چونکہ یہ شمارہ ہی سائنسی تحقیقات پر ایک خاص شمارہ ہے اس لحاظ سے اس کی اہمیت اور گراں قدر ہے سائنس اور امور سائنس کے متعلق بہت سے موضوعات پر کافی مدلل اور تحقیقی گفتگو ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر اسلم پرویز صاحب کا مکالمہ بھی اس شمارے کو اور ممتاز کرتا ہے انہوں نے الحاد اور مذہب بیزاری کے سلسلے میں مسلمانوں کو قصور وار گردانا ہے اور یہ بات بھی حقیقت ہے کہ یہ دین ان تمام مذاہب کی طرح نہیں ہے جس کو انسان نے اپنے من مانے طریقوں گھڑلیا ہے بلکہ یہ ایک دستور، زندگی گزارنے کا طریقہ اور ایک مشعل راہ ہے جس کے بغیر راہ طے نہیں کی جاسکتی۔ اس مکالمے میں آپ کا انداز بیان بہت خوب ہے ہر سوال کا جواب بحسن خوبی اور مدلل انداز سے دیا ہے۔ جویرہ ارم صاحبہ کا مضمون آج کے صورتحال کی بہترین منظر کشی کرتا ہے کہ سماج میں برائی عام ہوتی جارہی ہے اور اس کی بڑی وجہ دین سے دوری ہے ان جرائم کے سد باب کے لئے حکومتی سطح پر بھی سخت قانون پاس ہونا چاہیے۔ فوزیہ رباب نے اپنے عمدہ کلام کے ذریعہ اداسی اور مایوسی کی زندگی کے بجائے قلم کے ذریعہ سماج کی تشکیل کی طرف اشارہ کیا ہے۔ واقعی قلم ایک ایسا آلہ ہے کہ صفحہ قرطاس پر اس کے نقوش بڑے دوررس اور ثمر آور ہوتے ہیں۔ بنی نوع انسان کی علم کی شاہراہ سے آشنائی اور حرکت و عمل میں تغیر حکمت و دانش بینی کی آبیاری وآبپاشی اسی کی مرہون منت ہے اور تخریبات میں بھی اس کی حد تباہی و بربادی کا پیش خیمہ ہے لیکن حقیقتا یہ ایک ایسا معمار ہے جس نے خزاں کو بہار کا جلترنگ کر دیا۔

شہاب ثاقب اے ایم یو علی گڑھ

بابری مسجد تنازعہ

ماہ وسال کے آئینے میں

1528 مغل بادشاہ بابر کے ذریعے مسجد کی تعمیر۔

1853 مسجد کی زمین کے تنازعے کو لے کر تشدد کا پہلا واقعہ۔

1855 مسجد کے اطراف سیتا رسوئی اور رام چبوترہ کی تعمیر۔

1859 برطانوی حکومت نے مسجد اور دیگر جگہوں کے درمیان باڑھ تعمیر کی یہ تقسیم تقریباً ۹۰ سال قائم رہی۔

1949 مسجد میں رام کی مورتیاں رکھی گئیں اور اس کو بنیاد بنا کر ہندو و مسلم دونوں جانب سے مقدمہ دائر کیا گیا اور عدالتی فیصلے نے تمام جگہ پر پابندی لگائی۔

1950 پوجا کی اجازت کے لئے ہندو مہنت کی عرضی، اجازت نہ ملنے پر گیٹ کے باہر سے پوجا شروع کی گئی۔

1961 اتر پردیش سنی مرکزی وقف بورڈ کی جانب سے جگہ کی ملکیت کا مقدمہ دائر۔

1984 لال کرشن اڈوانی کی سرپرستی میں وشو ہندو پریشد نے رام مندر کی تعمیر کی جدوجہد کے لئے کمیٹی بنائی۔

1986 ایک ڈسٹرکٹ جج نے ہندوؤں کو عبادت کے لئے دروازے کھولنے کا حکم دیا اور دروازے کھول دئے گئے۔

1989 وشو ہندو پریشد نے مندر کے لیے اینٹوں کی پوجا اور شیلا نیاس شروع کیا، اور مسجد کو منتقل کرنے کے لئے مقدمہ دائر کیا۔

1990 اڈوانی کی رتھ یاترا اور کارسیوکوں کے ذریعے مسجد کی عمارت کو جزوی طور پر نقصان پہنچایا گیا۔

1991 بھارتیہ جنتا پارٹی کی اتر پردیش کے اسمبلی انتخابات میں کامیابی۔

1992 ۶ دسمبر کو وی ایچ پی، سنگھ اور بی جے پی نے ایودھیا میں ڈیڑھ لاکھ کے قریب کارسیوکوں کو جمع کیا اور مسجد کی عمارت کو شہید کیا۔ ملک بھر میں فسادات اور مسلمانوں کو نقصان پہونچایا گیا۔ لبرہن کمیشن کا قیام۔

1998 مرکز میں بی جے پی کی حکومت (دیگر اتحادی پارٹیوں کے ساتھ) اٹل بہاری واجپئی کی وزارت عظمی میں۔

2001 وشو ہندو پریشد نے رام مندر کی تعمیر کے عہد کی تحریک چلائی۔

2002 جنوری۔ معاملے میں ہندو مسلم مفاہمت کے لئے ایودھیا سیل کا قیام۔ فروری۔ کارسیوکوں کی واپسی پر گودھرا کی آتش زنی کا واقعہ۔ مارچ۔ گجرات میں مسلم مخالف فسادات۔ اپریل۔ زمین کی ملکیت کے سلسلے میں ہائی کورٹ کی سنوائی کی شروعات۔

2003 جنوری۔ ہائی کورٹ کا محکمہ آثار قدیمہ کو کھدائی اور مندر کے باقیات کی تحقیق کا حکم دیا۔ اگست۔ محکمہ کی مندر کے باقیات کے حق میں رپورٹ کی پیشکش ستمبر۔ مسجد کی شہادت کے سلسلے میں نفرت انگیز بیانات کے لئے ۷ لیڈروں پر مقدمہ

2004 بابری مسجد فیصلے پر سپریم کورٹ کا ریویو پٹیشن داخل کرنے سے انکار

2009 لبرہن کمیشن کی رپورٹ تیار۔ بی جے پی کے متعدد لیڈران کو ذمہ دار ٹھہرایا

2010 ستمبر۔ الہ آباد ہائی کورٹ کا زمین کی تقسیم کا متنازعہ فیصلہ، وقف بورڈ کو مسجد کی اصل عمارت کے بجائے دوسری جگہ دینے کا حکم۔ دسمبر۔ اکھل بھارتی ہندو مہاسبھا اور وقف بورڈ کا ہائی کورٹ فیصلے کو سپریم کورٹ میں چیلنج۔

2014 مرکز میں نریندر مودی کی قیادت میں بی جے پی کی حکومت۔

2015 ایودھیا میں ہندو مہنت کا رام مندر کی تعمیر کے لئے ملک بھر سے پتھر جمع کرنے کا اعلان۔

2017 مارچ۔ بابری مسجد کی زمین کی ملکیت کے سلسلے میں سپریم کورٹ کا تمام فریقین کو سمجھداری کے ساتھ معاملے کو حل کرنے کی ہدایت۔ اپریل۔ سی بی آئی کی درخواست پر لال کرشن اڈوانی اور دیگر بی جے پی اور سنگھ لیڈران پر مسجد کی شہادت کے سلسلے میں سازش کا مقدمہ چلانے کا فیصلہ۔

2018 الہ آباد ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف بابری مسجد ملکیت کے مقدمے کی سپریم کورٹ میں چیف جسٹس کی قیادت والی تین ججوں کی بنچ کے ذریعے سنوائی۔

کیا بابری مسجد کے نیچے مندر تھا؟

سپریا ورما
جیا مینن

ایودھیا میں ۲۰۰۳ء میں بابری مسجد۔رام جن بھومی کے متنازعہ مقام پر ASI(شعبہ آثار قدیمہ۔Archeological Survey of India) نے عدالتی فرمان کے مطابق کھدائی کی کاروائی کی۔جس کے مشاہدین کی حیثیت سے مصنفات نے، اس مضمون میں اس کاروائی کی بے ضابطگیوں اور متروک اور دقیانوسی طریقہ کار کے استعمال کا جائزہ لیا ہے۔ ASI کے غیر مناسب طریقہ کار اور رپورٹ پر مصنفات کی جانب سے درج کرائے گئے اعتراضات کے حوالے بھی اس مضمون میں شامل ہیں۔جس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ASI محض ایک مسمار شدہ مندر کے ''مفروضہ'' کے حق میں شواہد تخلیق کرنے کی غرض سے کام کر رہی تھی۔اور اس بات پر بھی زور دیا گیا ہے کہ ASI کا انداز کار ایک علمی و تحقیقی ادارہ کے بجائے ایک نوکر شاہی ادارہ کا ہے۔

سپریا ورما، کا تعلق جواہر نہرو یونیورسٹی کے مرکز برائے مطالعہ تاریخ سے ہے۔
جیا مینن، شعبہ تاریخ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے منسلک ہیں۔

سال 1961ء میں بابری مسجد۔رام جنم بھومی تنازعہ، مقدمہ برائے حق ملکیت کی حیثیت سے شروع ہوا۔اس مقدمہ میں مسلم تنظیموں نے سال 1528ء سے اس مقام پر مسجد کی عمارت کی موجودگی کی بنیاد پر اپنا دعویٰ ملکیت پیش کیا۔ اگلے 28 سالوں میں (1989ء) میں اس مقدمے میں شر پسندوں نے ایک نیا پہلو داخل کرتے ہوئے کہا کہ بابری مسجد کی تعمیر، وہاں موجود ایک مندر کو مسمار کرنے کے بعد کی گئی۔جس کے باعث مقدمہ ملکیت کے دائرہ میں تاریخ اور آثار قدیمہ (Archeology) کے مباحث کو داخلہ ملا۔

زیر نظر مضمون آثار قدیمہ کے حوالے سے معاملے کو حل کرنے یا نیا رخ دینے کے نقطہ نظر سے بحث کرتا ہے۔یہ ایک عام مفروضہ ہے کہ ''علم آثار قدیمہ'' (Archeology) ایک سائنس ہے، اور یہ کہ محض کھدائی اور اس سے دریافت شدہ نمونوں کی بنیاد پر حقیقی تاریخی معلومات کا تعین ہوسکتا ہے۔ اس طرح کی کھدائی میں دیوار اور فرش کے جزوی نشانات، جانداروں کی ہڈیاں، استعمال ہونے والے برتن اور دیگر اشیاء وغیر کے جزوی باقیات دریافت ہوتے ہیں۔ اور انہی باقیات کی بنیاد پر ماہرین آثار قدیمہ، ماضی میں ہوئی تعمیرات، سرگرمیوں

اور واقعات کا اندازہ لگاتے ہیں۔ کھدائی سے حاصل ہونے والے یہ باقیات ہی اس تحقیق کی بنیادی معلومات (Data) ہیں، اور اکثر و بیشتر جس بکھری ہوئی شکل میں یہ باقیات ہوتے ہیں، پہلے مرحلے پر ہی ایک معمہ قائم کردیتے ہیں۔ لہٰذا کھدائی کے مرحلے میں تمام چھوٹے بڑے باقیات کی انتہائی احتیاط کے ساتھ بازیافت کرنا اور اس کا ریکارڈ محفوظ کرنا انتہائی اہم ہوتا ہے، ساتھ ہی ان ذخائر (Deposits) اور ان کی نوعیت، کو محفوظ کرنا بھی اہم ہوتا ہے، جن کے درمیان سے باقیات دریافت ہوتے ہیں۔ اگلا مرحلہ اس مجموعہ باقیات کی معلومات اور اس کا عمیق تجزیہ کا ہوتا ہے۔ لیکن اکثر ماہرین چند منتخبہ نوادرات اور ان کے پہلے سے قائم شدہ تصورات پر قیاس کرتے ہوئے، تشریحات پیش کردیتے ہیں۔

بابری مسجد کے مقدمہ کے دوران علوم آثار قدیمہ سے مسلم فریقین کی ناواقفیت کے باعث انہوں نے، اس کھدائی میں مشاہدہ کی غرض سے پیشہ ورانہ خدمات حاصل کیں۔ نیز یہ اندیشہ بھی بدستور باقی تھا کہ کھدائی کا سارا انتظام چونکہ حکومت ہند کے شعبہ آثار قدیمہ (ASI-Archelogical Survey of India) کے ذمہ دیا گیا تھا، (جو اس وقت کی این ڈی اے (NDA) کی مرکزی حکومت کے زیر نگرانی وزارت برائے ثقافت کو جوابدہ تھا)، لہٰذا ماہرین کے لئے غیر جانبدارانہ خطوط پر کام کرنا، مرکزی حکومت کی خواہشات کے خلاف جانا تھا۔

جس وقت کھدائی کی شروعات ہوئی، بحیثیت آرکیالوجسٹ، ہم (مصنفات) نے براہ راست اس کاروائی کا مشاہدہ کرنے کی غرض سے دلچسپی دکھائی، اور اسی وقت سنّی مرکزی وقف بورڈ کی جانب سے ہم سے اس سلسلے میں رابطہ بھی کیا گیا۔ لہٰذا جس وقت الہ آباد ہائی کورٹ کی لکھنو بنچ نے 2003ء میں کھدائی کا حکم دیا، اس وقت سے ہم اس مقدمے کا حصہ بنے، اور مارچ تا اگست 2003ء کے درمیان جو کھدائی کی گئی اس کا براہ راست مشاہدہ کیا۔

زیر نظر مضمون میں 30 ستمبر 2010ء کو الہ آباد ہائی کورٹ کی خصوصی بنچ کے سامنے آثار قدیمہ کے ''شواہد و دلائل'' کی بنیاد پر پیش کئے گئے مدعا کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ جس کے لئے متنازعہ جگہ پر آثار قدیمہ کی کاروائی کے احوال جاننا بھی ضروری ہے۔ نیز جو مشاہدات کھدائی کے دوران محفوظ کیے گئے، ان کا تفصیلی جائزہ بھی اس مضمون کا حصہ ہے۔ اور ASI-Archelogical Survey of India کی جانب سے اس سارے عمل کے طریقہ کار پر جو اعتراضات ہماری جانب سے اٹھائے گئے، مزید ASI نے جو حتمی رپورٹ عدالت میں جمع کی اس پر کئے گئے اعتراضات (جو عدالت میں جمع کئے گئے) کا تذکرہ بھی اس مضمون میں شامل ہے۔ ASI کی رپورٹ میں شامل ان تشریحات کا تجزیہ (1970ء کی دہائی کے سیاق میں جب کہ ASI اس معاملے میں ڈائرکٹر جنرل بی بی لعل کے زیر نگرانی شامل تھی) بھی اس مضمون کا حصہ ہے۔ مزید ایک قابل توجہ بات یہ کہ ایک نوکر شاہی ادارہ ہونے کے باعث ASI-Archelogical Survey of India آثار قدیمہ کی کاروائیوں میں کیسی بندشوں اور رکاوٹوں کے حصار میں ہوتا ہے۔

ایودھیا تنازع کی مختصر تاریخ:

ایودھیا تنازع کی ابتدا سال 1857ء سے ہوتی ہے۔ جب ہنومان گڑھی (ہندو طبقہ ''ویشنو بیراگیوں'' کا مرکز) کے ایک مہنت نے مسجد کے صحن کے مشرقی حصہ پر قبضہ کرلیا، اور اس کے جنوب مشرقی حصہ پر ''رام چبوترہ'' (رام کی پیدائش کی جگہ) کی تعمیر کرڈالی۔ اسی سال مسجد کے موذن مولوی محمد اصغر نے مجسٹریٹ کو اس غاصبانہ قبضہ کے سلسلے میں درخواست دی۔ 1859ء میں برطانوی حکومت کے زیر انتظام ہندو اور مسلمانوں کی عبادت کی جگہوں کے درمیان ایک دیوار تعمیر کردی گئی۔ اور ہندووں کے داخلہ کے لئے مشرقی دروازہ اور مسلمانوں کے لئے شمالی دروازہ مختص کردیا گیا۔ اس غیر منصفانہ فیصلہ کے پیش نظر اگلے کئی سالوں (1860، 1877، 1883، 1884ء) میں مسلمانوں کی جانب سے مزید کئی پیٹیشن دائر کی گئیں، مگر تمام کو خارج کردیا گیا۔ بالآخر 1885ء میں مہنت رگھوبر داس نے زمین کی قانونی ملکیت کو اپنے حق میں کرنے کے لئے مقدمہ دائر کیا، تا کہ رام چبوترہ پر مندر تعمیر کیا جاسکے۔

اس مقدمہ کے چند اہم نکات یہ تھے۔

(1) رگھوبر داس، اس جنم استھان (رام کی جگہ پیدائش) کے مہنت یعنی اعلیٰ پجاری ہیں۔

(2) چبوترہ کی جگہ ہی رام کا جنم استھان ہے۔

(3) مسجد کی جگہ پر مندر ہونے کے سلسلے میں کوئی تذکرہ نہیں تھا۔
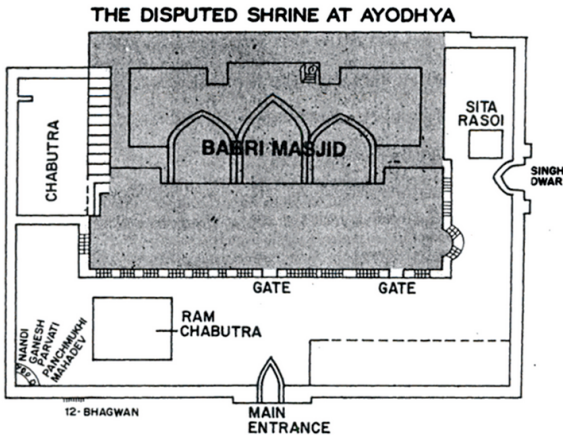
دوسری جانب 1870ء سے 1923ء کے دوران کئی سرکاری جرائد میں، ایودھیا کے حوالے سے مندر مسمار کرکے بنائی جانے والی کم از کم تین مساجد کے ریکارڈ شمار کئے گئے، جس میں بابری مسجد کا نام بھی شامل تھا۔ اس بات کو عام کرنے کے لئے مسجد کے صدر دروازے پر ایک پتھر کے کتبہ پر ''رام جنم بھومی: 1'' لکھ کر لگا دیا گیا۔ دسمبر 1949ء میں تلسی داس کے رام چرتمانس کے ورد کی غرض سے ایک 9 روزہ مجلس کا انعقاد کیا گیا۔ جسے ''اکھل بھارتیہ رامائن مہاسبھا'' نامی تنظیم نے منعقد کیا۔ اس مجلس کے اختتام پر 22 اور 23 دسمبر کی درمیانی رات میں رام اور سیتا کی مورتیاں مسجد کے اندر رکھ دی گئیں۔ 29 دسمبر کو

بابری مسجد کو متنازعہ جگہ قرار دے کر ایک حکم نامے کے ذریعے مسلمانوں کے لئے بند کر دیا گیا، اور صدر دروازے پر قفل ڈال دیے گئے۔ جبکہ دوسری جانب ہندوؤں کو ایک طرف کے دروازے سے درشن (زیارت) کی اجازت دی گئی، مزید یہ کہ چار پجاریوں کو مورتیوں تک جانے کی اجازت بھی تھی۔

16 جنوری 1950ء کو گوپال سنگھ وشارد (رکن ہندو مہاسبھا) نے ایک دیوانی مقدمہ عدالت میں دائر کیا کہ پوجا پاٹ کی غرض سے مورتیوں تک بلا رکاوٹ رسائی کا انتظام کیا جائے۔ اور ساتھ ہی مورتیوں کو ہٹائے جانے کے کسی بھی اندیشے کو خارج کرنے کی غرض سے دائمی حکم امتناع نافذ کیا جائے۔ 1959ء میں نرموہی اکھاڑہ کی جانب سے مسجد کی عمارت کو ان کے حوالے کرنے کے لئے مقدمہ دائر کیا گیا، جس کی بنیاد یہ بتائی گئی کہ یہ درحقیقت ایک مندر ہے۔ 18 دسمبر 1961ء کو سنی سینٹرل وقف بورڈ نے مسجد کی حوالگی کے لئے مقدمہ دائر کیا۔ 7 اور 8 اپریل 1984ء کو وشو ہندو پریشد نے ایک نشست میں ایودھیا، کاشی اور متھرا میں مساجد ہٹا کر مندر تعمیر کرنے کا عزم کیا، جس میں ایودھیا کے معاملے کو متفقہ طور پر ترجیح دی گئی۔ 1986ء میں بابری مسجد کے تالے کھول دیے گئے اور معاملات کو الٰہ آباد کورٹ کی فیض آباد بنچ سے لکھنؤ بنچ منتقل کر دیا گیا۔ گوپال سنگھ وشارد کا مقدمہ پہلا مقدمہ قرار پایا۔ اسی نوعیت کا ایک مقدمہ (مقدمہ نمبر ۲) جسے پرمہانس رام چندر داس نے داخل کیا تھا، جسے بالآخر نکال لیا گیا۔ نرموہی اکھاڑہ اور سنی مرکزی وقف بورڈ کے مقدمات بالترتیب تیسرے اور چوتھے شمار کیے گئے۔ 1989ء میں الٰہ آباد ہائی کورٹ کے ریٹائرڈ جج اور وشو ہندو پریشد کے سابق صدر دیوکی نندن اگروال نے رام للا براجمان (ننھے رام) کی جانب سے پانچواں مقدمہ داخل کیا، جس میں اگروال کی حیثیت رام للا سکھا (دوست، قانونی نمائندہ) کی تھی۔ جس کی موت کے بعد ٹی پی ورما اور اس کے بعد ابھی ایک آر ایس ایس کارکن ترلوکی ناتھ پانڈے کو حاصل ہے۔ اس پانچویں مقدمے کی پیروی میں روی شنکر پرساد (موجودہ مرکزی وزیر برائے قانون وانصاف) بحیثیت سینئر کاؤنسل شامل ہیں۔

ایودھیا کا تاریخی پس منظر (آثار قدیمہ کی کاروائیوں کے تناظر میں)

1862-63ء میں آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا (ASI) کے ڈائرکٹر جنرل بننے بعد الیکزنڈر کننگھم (Alexender Cunningham) نے ایودھیا کا سروے کیا۔ ان کی بنیادی دلچسپی، بودھ مذہب کے مقدس مقامات کی شناخت تھا، جن کی نشاندہی چین کے بودھ راہب اور سیاح زانزنگ (Xuanzang) اور فیکسی آن (Faxian) نے کی تھی۔ انہوں نے تین ٹیلوں کو تاریخی اہمیت کا حامل بتایا، جن میں منی پربت، کوبیر پربت اور سگریوا پربت شامل تھے۔ جس میں بالترتیب پہلا اشوکا کا استوپا، دوسرا استوپا جس میں گوتم بدھ کے بال اور ناخن وغیرہ تھے، اور تیسری کو ایک بدھ خانقاہ کی حیثیت سے شناخت کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے رامائن کی کہانیوں کے مطابق رام کے جنم استھان اور کچھ زبانی روایتوں کا بھی ریکارڈ محفوظ کیا۔ الیکزنڈر کننگھم لکھتے ہیں'' (1871:321) تراشے ہوئے ستونوں اور مورتیوں کے ڈھیر سے بنے ٹیلے (ایودھیا میں) نہیں ہیں۔ جیسا کہ بالعموم دیگر قدیم شہروں کے معاملے میں ہوتا ہے۔ بلکہ یہاں کچرے اور مٹی کے ڈھیر پر مشتمل چھوٹے، بے قاعدہ ٹیلے ہیں، جن میں سے اینٹیں نکال کر پڑوسی شہر فیض آباد میں گھروں کی تعمیر میں استعمال کیا گیا ہے۔'' انہوں نے چند براہمن مندروں کی طرف اشارہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ جدید فن تعمیر کے نمونے ہیں، جنہیں مسلمان حکمرانوں کے ذریعے مسمار کیے گئے قدیم مندروں کی جگہ تعمیر کر لیا گیا۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ رام کے جنم استھان کا تذکرہ کرنے کے باوجود انہوں نے بابری مسجد یا اس جگہ سے اس تعلق کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ دوسرے لفظوں میں انہوں نے رام جنم استھان کی روایتوں کو جمع کیا مگر ایسے کسی مندر کی تباہ کاری اور اس پر مسجد کی عمارت کی موجودگی کا ذرہ برابر بھی تذکرہ نہیں۔

کم وبیش ایک صدی کے بعد اے کے نرائن، ٹی این رائے اور پی سنگھ پر مشتمل، بنارس ہندو یونیورسٹی کی ایک ٹیم نے اس جگہ کی تصرفی تاریخ کی معلومات کی غرض سے کھدائی کی۔ (IAR-1969-70:40-41)۔ جین گھاٹ، لکشمن ٹیکری اور نال ٹیلا پر مشقی کاٹ (Trial Cuttings) کی گئیں۔ جس کی بنیاد پر تین ثقافتی ادوار (Cultural Periods) کی نشاندہی کی گئی۔ جس میں دو، یکے بعد دیگرے جب کہ تیسرا کچھ علٰحدگی کے ساتھ پایا گیا۔ البتہ یہاں سے دریافت شدہ سامان یا زمانی تاریخ کے حوالے سے کچھ تفصیلات نہیں دی گئی، سوائے چند ایک نوادرات کے جو تینوں میں سے قدیم ترین ثقافت سے ماخوذ، سیاہ پالش والے نوادرات تھے۔ اسی ٹیم نے کوبیر پربت (''کوبیر ٹیلہ'' جس کا الیکزنڈر کننگھم نے بھی سروے کیا تھا) کے نیچے سے اینٹ کی تعمیرات کے بارے میں بتایا، مگر کسی قسم کی کوئی تفصیلات فراہم نہیں کی۔

دوسری طرف 1972ء میں اے ایس آئی ASI کے ڈائرکٹر جنرل کی حیثیت سے ریٹائر ہو کر، جیواجی یونیورسٹی، گوالیار میں تقرری حاصل کرنے والے بی بی لعل نے 1975ء میں ایک پروجیکٹ بنام ''رامائن کے مقامات کا آثار قدیمہ کے تناظر میں مطالعہ'' (The Archeology of Ramayana Sites) شروع کیا، جس کا افتتاح اس وقت کے مرکزی وزیر تعلیم وثقافت، ایس نور الحسن نے ایودھیا میں کیا۔ مگر کچھ ہی عرصہ میں پروفیسر لعل کے، شملہ میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانس اسٹڈیز میں منتقل ہو جانے کے باعث کوئی خاطر خواہ پیش رفت نہ ہوئی۔ لیکن 1977ء میں اس پراجیکٹ کو دوبارہ اسی انسٹی ٹیوٹ کی نگرانی میں، اے ایس آئی ASI کے ساتھ مل شروع کیا گیا۔ جس میں اے ایس آئی کے ذمے اخراجات اور افراد کی فراہمی تھی۔ 1986ء میں یہ پراجیکٹ اپنے اختتام کو پہونچا۔ جس کے تحت ایودھیا کے علاوہ سرینگا ویراپور، بھاردواج آشرم، نندی گرام اور چتر کوٹ میں بھی کھدائی کی گئی۔ (Lal 2002:42) آج اتنا عرصہ بیت جانے کے بعد بھی سرینگا ویراپور میں ایک ٹنکی کے علاوہ اور کوئی بھی رپورٹ شائع نہیں کی گئی۔ ایودھیا کی کھدائی کے تعلق سے بھی محض چند معلومات IAR 1976-77 اور IAR 1979-80

سے دستیاب ہیں۔لعل نے اس کاروائی کے دوران رام جنم بھومی کے ٹیلہ اور ہنومان گڑھی کے مغرب میں واقع کھلے میدان پر توجہ دی، جس میں سیتا کی رسوئی کے بھی چند گڑھے شامل تھے۔جس میں اسے ساتویں صدی قبل مسیح سے تیسری صدی عیسوی تک کے آثار ملے۔جبکہ گپتا عہد (چوتھی تا چھٹی صدی عیسوی) کے آثار واضح نہیں ہوئے۔تاریخ کے شروعاتی ادوار (چھٹی صدی قبل مسیح تا چھٹی صدی عیسوی) کے بعد محض مٹی اور گڑھے تھے، حتیٰ کہ گیارہویں صدی کے آثار برآمد ہوئے۔بعد میں عہد وسطیٰ کے اواخر کے چند تعمیراتی مواد جیسے اینٹ، چونا، پتھر وغیرہ کے علاوہ اواخر کے دور سے کوئی خاص اور قابل ذکر آثار دریافت نہیں ہوئے (IAR 1976-77:53)۔رپورٹ IAR 1979-80 بھی ایودھیا میں عہد وسطیٰ کے آثار وذخائر کے تذکرہ سے خالی ہے۔اکتوبر 1990ء میں لعل نے آر ایس ایس کے رسالے ''منتھن'' میں ایک مضمون لکھا۔لعل نے اپنے مضمون میں 1975 تا 80ء کی کھدائی کے دوران لی گئی ایک تصویر بھی شامل کی۔تصویر میں اینٹ کے کچھ ٹکڑوں کا ڈھیر تھا، جس پر اس نے یہ دعویٰ کیا کہ یہ مندر کے ستونوں کی بنیاد ہے، جسے بابر نے مسمار کیا۔ان ستونی بنیادوں کو مندر کے اہم ثبوت کے طور پر پیش کیا گیا۔حیرت کی بات یہ ہے اگر یہ اتنی ہی اہم بات ہے تو بجائے آثار قدیمہ سے متعلق کسی علمی جریدہ کے، ایک سیاسی میگزین میں کیوں شائع کی گئی۔ (کیا یہ بھی محض ایک اتفاق ہی تھا کہ 1989ء کے اواخر میں آثار قدیمہ کے مباحث کو مقدمہ میں داخل کیا گیا اور اس وقت 1990ء میں پہلے ایس پی گپتا، ریٹائرڈ ڈائرکٹر نیشنل میوزیم اور پھر لعل کے مضامین شائع ہونے لگے؟)

3 تا 7 مئی 1998ء میں کروشیا میں ''ورلڈ آرکیالوجیکل انٹر کانگریس'' میں اس نے ایک مقالہ پڑھتے وقت اپنے ایک پرانے بیان (10 فروری 1991ء کو وجئے واڑہ میں دیے گئے) کا حوالہ دیا اور کہا کہ جن ستونی بنیادوں کو اس نے دریافت کیا ہے، ان کے اور مسجد کے پتھروں سے تعمیر شدہ ستونوں کے بیچ کے تعلق، اور مندر کی آثار کی موجودگی کا ادراک، مسجد کے نیچے کھدائی کرنے پر ہی کیا جاسکتا ہے۔11 فروری 1991ء کو اخبار ''ہندوستان ٹائمز'' میں اس بیان کی اشاعت اور تنقیدوں کو دیکھتے ہوئے، اس نے 13 فروری 1991ء کو ''دی اسٹیٹس مین'' اخبار میں جوابی بیان شائع کرایا اور دوبارہ مسجد کے نیچے کھدائی کی بات دہرائی۔ظاہر ہے اے ایس آئی کے سابق ڈائرکٹر جنرل، کی ایسی بات کے مضمرات نظر انداز نہیں کیے جاسکتے۔بالآخر اسی ادارے یعنی ASI نے اس مرحلہ کو بھی عدالت کے کہنے پر مکمل کیا۔اتنا سب ہونے کے بعد، یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ ASI کھدائی کے حوالے سے کیا رپورٹ پیش کرتی؟

ایودھیا میں سال 2003ء میں کھدائی کی کاروائی

1 اگست 2002ء میں ہائی کورٹ کے حکم پر ASI نے ایودھیا میں آثار قدیمہ کا سروے کیا۔اس وقت تک فریقین کے دلائل واعتراضات عدالت نے محفوظ کر لئے تھے، اور مسجد کی اصل عمارت کے نیچے کا سروے (Ground Penetrating Survey) کیا جانا تھا۔اس زمین دوز سروے کے لئے ASI نے ٹوجو انٹرنیشنل (Tojo International) نامی ادارے سے بیرونی خدمات حاصل کی۔یہ سروے 30 دسمبر 2002ء سے 17 جنوری 2003ء تک جاری رہا، جس کے بعد اس ادارے نے اپنی رپورٹ ASI کے حوالے کردی۔

اس رپورٹ کے مطابق زمین میں آدھا میٹر سے ساڑھے پانچ میٹر تک، ایک بڑے رقبہ میں عمومی بے قاعدگیاں (Anomalies) (ایک راڈار Ground Penetrating Radar کے ذریعے زمین میں ریڈیائی لہریں بھیجی جاتی ہیں، جب ان لہروں کے راستے میں رکاوٹوں کو Anomalies یا بے قاعدگیاں کہا جاتا ہے، جو زیر زمین عمارتی ڈھانچہ کی موجودگی کا پتہ دیتی ہیں) پائی گئیں، جو قدیم وجدید تعمیرات کے ستون، بنیاد کی دیواریں، فرش وغیرہ پر مشتمل تھیں۔تاہم ان بے قاعدگیوں کی اصل صورتحال کی تصدیق لئے Ground Truthing (مزید عملی تجربات کے ذریعے شواہد جمع کرنے کا عمل) درکار ہے۔جسے Archeological Trenching (مجوزہ مقام اور اطراف میں لمبے گڑھوں کی کھدائی) کے ذریعے کیا جا سکتا ہے۔(Robillard et al 2003:31)۔فرش اور دیواروں کے بے قاعدہ ملبے کا اشارہ دینے والی ایسی کوئی بھی رپورٹ ایک عام 10 میٹر کے ٹیلے کی زمین کے نیچے کی عمومی صورتحال کا بیان ہوسکتی ہے۔ مزید یہ کہ GPR سروے کی ایسی رپورٹس میں محاصلات کے ذریعے عمارت کی نوعیت بیان نہ ہونا بھی ایک عام بات ہے۔درحقیقت رپورٹ کا اصل لب لباب محض، مختلف سطحوں پر باقاعدگی کا پایا جانا تھا۔

رپورٹ میں زیر زمین ستونوں کی موجودگی کی خبر دی گئی تھی، حالانکہ کھدائی کے دوران کوئی ستون نہیں برآمد ہوئے۔اس کے بالمقابل بابری مسجد (مسجد کی مسماری کے باعث) کے ملبے سے مسجد کے دوستون برآمد ہوئے۔(Manjhi and Mani 2003:140, 148)۔6 دسمبر 1992ء کو بابری مسجد کی مسماری کے موقع پر مسجد کے ملبے کو ہی جمع کر کے اس پر رام للا کی مورتی رکھ کر مندر کا عارضی انتظام کیا گیا تھا۔مسجد کی شہادت کے وقت تین دنوں تک لاء اینڈ آرڈر کی دھجیاں اڑائی گئیں، اور عام لوگ مسماری کے وقت سے مندر بنائے جانے تک کے عمل سے بے خبر ہی رہے۔ ایسے میں فرش یا زمین کی سطح پر پائے جانے والی اشیا، آثار قدیمہ کے شواہد کی حیثیت سے کوئی وقعت نہیں رکھتیں۔

رپورٹ کے ساتھ منسلک Annexure A میں جو Geophysical Interpretation Map (طبعی زمینی خصوصیات کی تشریح کے مطابق مرتب کردہ نقشہ) موجود ہے، اس میں ASI کے ذریعے نشان زدہ ستونی بنیادیں کسی بھی طرح کی سیدھ یا خطی ترتیب (Grid) کے امکان سے خالی ہیں۔

GPR سروے میں نشان زدہ بے قاعدگیوں کے حوالے سے ASI نے بتایا ''184 میں سے 39 مقامات پر جہاں بے قاعدگیوں کی نشاندہی

کی گئی تھی، مطلوبہ گہرائی اور مقام تک کھودنے پر تصدیق ہوگئی، جبکہ بقیہ 74 جگہوں پر مطلوبہ گہرائی تک کھدائی کے باوجود رپورٹ کے مطابق شواہد نہیں ملے۔ (Manjhi and Mani 2003:19)۔ درحقیقت ASI کے ایجنڈا میں اوپری سطح کی کچھ تعمیرات زیادہ اہم تھیں، لہٰذا 27 مقامات کی جانچ کے حوالے سے مزید کھدائی اور تصدیق کی زحمت ہی نہیں اٹھائی گئی۔ بہر حال ASI کے اس دعویٰ کی جانچ کے لئے جب ہم نے مشاہدہ کیا تو محض 21 بے قاعدگیوں کی جانچ (20 سینٹی میٹر تک) کی گئی تھی، جس میں سے 10 فرش کے پتھر، 5 ستون کی بنیادیں، دو تعمیری سجاوٹ کے حصے، تین عمارتی ڈھانچہ کے حصہ اور ایک دیوار تھے۔ بقیہ جن کی تصدیق کی خبر دی گئی تھی وہ اپنے مقام پر، لیکن گہرائی کے اعتبار رپورٹ کے برخلاف مختلف گہرائیوں (50 سم تا 2 میٹر) پر پائے گئے۔

فرش، دیوار اور ستون جیسے آثار کی برآمدات کی بنیاد پر ہائی کورٹ نے ASI کو 5 مارچ 2003ء کو سروے (کھدائی) کا حکم دیا تاکہ GPR رپورٹ میں نشاندہ ان بے قاعدہ برآمدات کی اصل نوعیت معلوم کی جا سکے (Manjhi and Mani 2003:8)۔ اور مسجد کی تعمیر سے قبل کسی مندر کی مسماری کے تعلق سے کوئی حتمی بات کہی جا سکے۔ 12 مارچ 2003 کو ASI نے سروے کا آغاز کیا، یہ کاروائی 7 اگست 2003ء تک جاری رہی۔ کھدائی وہیلر Wheeler Method کے طریقے پر شروع کی گئی، جس میں 4x4 میٹر کے گڑھے بنائے گئے (اس طریقے میں جس حصہ پر کاروائی مطلوب ہوتی ہے اس میں مساوی سائز کے متعدد چوکور ایک میٹر کے فاصلے سے نشان لگا کر کھودے جاتے ہیں، بیچ کا ایک میٹر کا حصہ جو چلنے پھرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے اسے Baulk کہتے ہیں، گڑھوں میں عمودی تراش کا حصہ Sections کہلاتا ہے، جس میں مختلف عہد کی زمینی پرتیں دکھائی دیتی ہیں اور ان پرتوں کے مطالعہ کو Stratigraphy کہتے ہیں)، جن کے درمیان ایک میٹر کا فاصلہ تھا۔ مشینوں کے بجائے مزدوروں کے ذریعے کھدائی کی گئی اور ہر گڑھے کا ایک نگران Supervisor مقرر کیا گیا۔ جس کے ذمہ کھدائی کے روزانہ کے ریکارڈ کا اندراج کرنا تھا۔ چونکہ سپروائزرس کے متعینہ گڑھے بدلے جاتے تھے، لہٰذا ایک گڑھا کی نگرانی، کئی لوگوں کے ذمہ بھی آتی۔ لہٰذا معلومات کے اندراج کے لئے دی گئی نوٹ بک (Site Note Book) میں ایک سے زائد گڑھوں کے تعلق سے معلومات ہوتی تھی۔ معلومات میں یہ نکات شامل تھے۔ کھدائی کی شروعاتی اور اختتامی گہرائی، پرتوں کا شمار، اور دن بھر میں برآمد ہونے والے نوادرات اور ان کی خاصیتیں۔

آثار قدیمہ کی کھدائی کے وقت عام طور سے یہ طریقہ اپنایا جاتا ہے کہ پس منظر اور ہر سطح اور پرت کی کھوج کے بعد دستاویزی ثبوت کی تفصیل جمع کی جاتی ہے۔ لیکن اس معاملہ میں کسی بھی قسم کی کوئی کھوج کا دستاویزی ثبوت مہیا نہیں ہے۔

نوٹ بک کے علاوہ، ایک رجسٹر میں بھی روز کی کاروائیکے حوالے سے معلومات درج کی جاتی تھی، جیسے روزانہ کھودے گئے گڑھے، شروعاتی اور اختتامی گہرائی، اور برآمد ہونے والے نوادرات، ہڈیاں، چکنی مٹی کے برتن وغیرہ۔

روزانہ کام ختم کرنے سے قبل فریقین کے نمائندوں کو برآمدات دکھا کر رجسٹر پر بطور تصدیق ان کے دستخط لیے جاتے تھے۔ ایک رجسٹر نوادرات کے اندراج کے لئے بھی مخصوص تھا۔ جس میں نوادرات کی تفصیلات جیسے گڑھا، پرت، گہرائی، ناپ اور دیگر وضاحت۔ ان نوادرات کو ایک رجسٹریشن نمبر دیا جاتا تھا۔ اس کاروائی میں کل 90 گڑھے کھودے گئے تھے، جو تقریباً کل رقبہ کے برابر تھا۔

اگست 2003ء میں رپورٹ دو حصوں میں عدالت میں جمع کی گئی۔ پہلے حصے میں تحریری معلومات اور دوسرے حصے میں پلیٹیں (نوادرات کے نمونے پر مشتمل)۔ مروجہ طریقہ کے مطابق رپورٹ میں تعارف کا باب، کھدائی کے متعلق ابواب، طبقات الارضی Stratigraphy اور زمانی معلومات Chronology، ظروف، تعمیری آرائش کی اشیا، مٹی کے مجسموں کے ٹکڑے، کتبہ کاری کے نمونے، مہر، سکے، وغیرہ پر مبنی ابواب اور نتائج کا خلاصہ موجود تھے۔ حیرت کی بات یہ رہی کہ ASI کی دیگر رپورٹوں کے برخلاف اس رپورٹ میں نتائج کے خلاصہ پر کسی مصنف کا نام غائب تھا، جب کہ بقیہ سارے ابواب پر ایک یا کئی مصنفین کے نام درج تھے۔ مزید یہ کہ جانوروں اور انسانی ہڈیوں اور ڈھانچے پر مبنی کوئی باب نہیں تھا۔ (Manjhi and Mani 2003: Plate 58)۔ موخر الذکر میں مسجد کے شمالی اور جنوبی حصے میں موجود قبرستان کے باقیات رہے ہوں گے۔

بابری مسجد کے نیچے عمارتی ڈھانچے

رپورٹ کے خلاصہ نتائج کے باب کے آخری پیراگراف سے درج ذیل عبارت ملاحظہ فرمائیں۔

اب بحیثیت مجموعی، مسجد کی عمارت کے نیچے پائے جانے والی قدیم عمارت کے آثار کی بنیاد پر، اور دسویں صدی سے لے کر تا حال مسجد کی عمارت کی تعمیر تک عمارتی ڈھانچے میں پائے جانے والے استمرار، اور ساتھ ہی پتھر اور مزینہ اینٹوں کے نمونے، رام اور سیتا کی جوڑی کی مسخ شدہ مورتی اور تعمیراتی عناصر پر بیل بوٹوں کا نقش، املکا (مخروطی برج کے بالائی حصے پر سجاوٹ کے لئے استعمال ہونے والا عنصر)، کپوتپالی طرز کی چوکھٹ، نصف دائروی دیواری ستون، پرت دار ستون کا مثلثی دستہ، کنول نما سانچہ (شاکلہ)، دائروی مندر جس کے شمالی حصہ میں پرنالہ (پانی کی نکاسی کا جھرنا)، بڑے عمارتی ڈھانچے سے منسلکہ 50 ستونی بنیادیں ایسے باقیات کی جانب اشارہ کرتے ہیں، جن کا تعلق شمالی ہند کے مندروں کی تعمیری خصوصیات سے ہے۔ (Manjhi and Mani 2003:272)۔

بنیادی طور پر مسجد کی عمارت (بابری مسجد کو رپورٹ میں ہر جگہ ''متنازعہ عمارت'' لکھا گیا ہے، جب کہ رام چبوترہ وغیرہ کے باقاعدہ نام موجود ہیں) کے نیچے مندر کی موجودگی کے بارے میں جو ثبوت پیش کیے گئے وہ دو نوعیت کے تھے۔ ایک تعمیراتی عناصر کے باقیات (Architectural Fragments)، دوسرے ایک بڑا عمارتی ڈھانچہ، جس کی مغربی دیوار (۱۷۷ میٹر چوڑی) کے صرف 50 ستونی بنیادوں کے حصے ملے۔

تعمیراتی عناصر کے باقیات کے باب میں 445 باقیات کا تذکرہ ہے، جبکہ منظم زمینی پرتوں سے 40 باقیات ہی حاصل ہوئے ہیں، نیز ان کا کوئی تعلق مندر کے فن تعمیر سے نہیں۔ مزید جن 12 عناصر کا تذکرہ رپورٹ میں ہے، یہ تمام ہی زمین کے اوپری ملبے سے برآمد ہوئے ہیں، نہ کہ کھدائی سے۔ جنہیں آرکیالوجی میں کوئی درست شواہد کے طور پر تسلیم نہیں کیا جاتا۔ لہٰذا اصولی طور پر بابری مسجد کے فرش کے نیچے کی سطحوں سے برآمدات کو شواہد کی حیثیت سے تسلیم کرنا ہی درست ہے، نہ کہ فرش پر پائی جانے والی اشیا، جنہیں کسی اور جگہ سے بھی لاکر ڈالا جاسکتا تھا۔ جن 12 چیزوں کا خصوصی تذکرہ آیا ان کے مندرجہ ذیل مشمولات ہیں۔ سریواست (ابدی گرہ کی نشانی) کے نشان سے مزین پتھر کا فرش، جس کا تعلق جین مذہب سے ہے؛ معین نما نقش والے پتھر کا فرش (جو کہ خود بابری مسجد کا حصہ ہو سکتا تھا، کیونکہ یہ مسجد کے اندر عربی کندہ کاری کے نچلے حصے سے کافی مماثلت رکھتا تھا)؛ املکا (مخروطی برج کے بالائی حصے پر سجاوٹ کے لئے استعمال ہونے والا عنصر)، نصف دائروی دیواری ستون کے ساتھ دروازے کی شکستہ چوکھٹ، کنول کے پھول و پتی پر مشتمل سانچے کے ذریعے بنائے گئے نقش، پتھر کے پھول نما تراشے گئے ڈیزائن، انسانی جسم کے کمر کے حصے پر مشتمل دو مجسموں کے باقیات جسے خدائی جوڑی (رام اور سیتا) بتایا گیا۔

سائٹ نوٹ بک نمبر 7، کے صفحے 36 پر ایک اندراج اس طرح ہے، ''اہم دریافت، انسانی مجسموں کے مسخ شدہ حصہ؟ (1.2 میٹر کی گہرائی پر روشنی میں آیا)، سیدھا پیر واضح (طور پر مسخ)، بیٹھنے کی سی وضع۔'' روزانہ اندراج کے رجسٹر آئی (I) کے صفحہ نمبر 276 پر اسی شئے کا بیان ایسے ہے ''بلوا پتھر کا مجسمہ (ٹوٹا ہوا)۔'' جبکہ نوادرات کے خصوصی اندراج کے رجسٹر میں کچھ ایسا بیان ہے ''مجسمہ کا حصہ (بنا چہرہ کا)'' اور ریمارکس کے کالم میں ''مسخ شدہ جوڑا''۔ جبکہ رپورٹ میں صفحہ 130 پر دیے گئے جدول میں بیان کچھ ایسا ہے ''انتہائی مسخ شدہ خدائی جوڑا، جو للتن مدرا طرز پر بیٹھا ہے۔ موجودہ حصہ کمر، ران اور پیر کا معلوم ہوتا ہے۔'' نوادرات کے اندراج والے رجسٹر کے لیے اس شئے کا 17 جولائی 2003ء (رجسٹر میں نوادرات کے بیگ کو کھولنے کی تاریخ کے مطابق) کو مشاہدہ کیا گیا، اور بعد میں اس نوٹ کے ساتھ مہر بند (سیل) کیا گیا کہ تصویریں لینے کے کھولنے کے بعد اسے دوبارہ مہر بند کیا جائے گا۔ 22 جولائی 2003ء کو تصویر کشی کے لئے بیگ کھولا گیا اس نوٹ کے ساتھ بند ہوا ''دو برآمدات کی تصویر کشی کے لیے کھولا گیا، دوبارہ اور اس کے بعد مہر بند کیا گیا''۔ لہٰذا یہ واضح ہے کہ 6 جولائی 2003ء کو اس کی دریافت کے وقت اس کا مشاہدہ ہوا، پھر نوادرات کے رجسٹر میں اندراج کے وقت یعنی 17 جولائی 2003ء کو اس کا مشاہدہ ہوا۔ اور بالآخر 17 جولائی 2003ء کو تصویریں لی گئیں۔ بظاہر اس کے علاوہ تو کوئی اور اسٹڈی نہیں کی گئی، تو کیا وجہ ہے کہ رپورٹ میں اس کے تعلق سے اس قدر مختلف بیان موجود ہے۔ رپورٹ کی تحریر دریافت کرنے والے کی تحریر، یا اندراج کرنے والے کی تحریر سے اس درجہ مختلف کیوں ہے۔ آخر کس نے بعد میں رپورٹ میں اس شئے کو تقدیس (خدائی جوڑا) عطا کر دی۔ حتیٰ کہ پلیٹ میں (Manjhi and Mani 2003:Plate235) ابتداً سے اس شئے کو اوما مہیشوری لکھا گیا تھا، جسے بعد میں سفیدی کا استعمال کر کے ''خدائی جوڑا'' میں تبدیل کر دیا گیا۔ پلیٹ میں سفیدی کے استعمال سے کی گئی یہ تبدیلی، متذکرہ پلیٹ کو روشنی کے مقابل بغور دیکھنے سے واضح ہو جاتی ہے۔ کیا یہ تبدیلی اس غرض سے کی گئی تھی کہ ایک ویشنو کے مندر میں اوما مہیشوری کی مورتی معاملات کو مزید مشکل بنا دیتی۔

مندر کی موجودگی کے نظریہ کو بالخصوص ''ستونی بنیادوں'' کے حوالے قائم کرنے کی کوشش کی گئی، جو بالقیاس 2003ء کی کھدائی میں ASI نے دریافت کی۔ جیسا کہ اس سے قبل تذکرہ آیا سابق ڈائرکٹر لعل، وہ شخص ہے جس نے ''منتھن''، میں اپنے مضمون میں ستونی بنیادوں کو مندر کی موجودگی کے لئے اہم بنا کر پیش کیا۔ جس کے مطابق ان بنیادوں پر پتھر کے ستون استوار تھے، اور ان ستونوں کے سہارے چھت موجود تھی۔ لہٰذا ان بنیادوں پر اس قیاسی عمارت کا سارا وزن پڑتا تھا۔ محسوس ہوتا ہے کہ لعل کے اسی مفروضہ کو حقیقت بنانے کے لئے ASI نے یہ 50 ستونی بنیادیں تخلیق کر کے دریافت کر لیں۔ ورنہ یہ لعل کا مفروضہ محض مفروضہ ہی رہ جاتا۔

یہ ستونی بنیادیں بے ترتیب اینٹ کے ٹکڑوں اور مٹی (کیچڑ) سے بنی ہوئی ہیں، سائز اور بناوٹ کے اعتبار ایک دوسرے سے قدرے مختلف، اور ان کا

درمیانی فاصلہ بھی بدلتا ہوا تھا (1.98 تا 5 میٹر کے بیچ)۔ ASI نے ان 50 ستونی بنیادوں کو شمالی حصے میں دریافت ہونے والی 10 ستونی بنیادوں (جو تکنیکی اعتبار سے واقعی بنیادیں ہیں) کے موافق بالکل حقیقی ثابت کرنے کی کوشش کی۔ شمالی حصہ کی ستونی بنیادوں میں چوکور بلواچٹانی پتھروں کے جوڑ سے مکعب نما بنیادیں بنتی ہیں، جو اوپر سے کھلی رہتی، جس میں ستون فٹ ہوجاتے۔ یعنی ان 10 بنیادوں کا ڈھانچہ ان دیگر 50 بنیادوں سے قطعی مختلف تھا۔ شکل نمبر 1 میں ستونی بنیاد نمبر 7، شمالی حصے میں دریافت شدہ بنیاد کا نمونہ ہے، جبکہ نمبر 10 بقیہ گھڑی گئیں بنیادوں کا نمونہ ہے۔ سیاہ پتھروں کے جو ستون بابری مسجد کا حصہ ہیں، انہیں ASI اور لعل نے اس مندر کے اصل ستون بتایا جو مسجد کے نیچے دفن ہے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ اگر یہ اس مندر کے ستون ہیں تو شمالی حصہ میں دریافت ہونے والی ان بنیادوں میں فٹ ہو جاتے۔ جبکہ سائز کے اعتبار سے ستون اور بنیادوں میں بڑا فرق ہے۔ بنیادوں کے خانہ کے سائز 48.5x43 سم، 50x50 سم، 47x46 سم، 48x56 سم، 49.5x49 سم اور 51x51 سم تھے۔ جبکہ ستونوں کے سائز 21x21 سم اور 24x24 سم تھے۔ یہ تو بہر حال واضح ہوجاتا ہے کہ مسجد کے سیاہ پتھر کے ستون ان بنیادوں میں فٹ ہونے سے رہے۔ لہٰذا ان بنیادوں کا کیا تصرف رہا ہوگا، مضمون میں آگے اس کا تذکرہ آئے گا۔

جیسا کہ تذکرہ آیا شمالی حصہ کی بنیادوں کے علاوہ باقی بتائی جانے والی ستونی بنیادیں اصلاً کسی ستون کی بنیادیں ہیں ہی نہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اینٹ کے ٹکڑوں پر مشتمل ان ڈھیروں کی اصل کیا ہے۔ ہمارے مشاہدے کے مطابق یہ سرخ چونے کے بنے فرش کی نچلی پرت کی اینٹیں ہیں، جس پر مسطح فرش تعمیر کیا گیا ہے۔ بابری مسجد کے فرش (فرش نمبر 1) کے نیچے تین سرخ چونے (چونا، اینٹ کی دھول کی ملاوٹ اور نمی سے حفاظت کرنے والے چند عناصر سے بننے والے) کے فرش کی تین پرتیں برآمد ہوئیں۔ فرش نمبر 1 سے فرش نمبر 2 کے درمیان 40 سم کا فاصلہ، فرش نمبر 2 تا فرش نمبر 3 کے درمیان 20 سم کا فاصلہ، اور فرش نمبر 3 تا فرش نمبر کے درمیان 40 سم کا فاصلہ پایا گیا۔ سرخ چونے کی ان پرتوں (فرش) کے نیچے اینٹ کے ٹکڑوں، مٹی اور چند ایک پتھر پر مشتمل ایک پرت موجود تھی، جو اس فرش کی نچلی سطح یا بنیاد بناتی ہے۔ اسی نچلی سطح یا فرش کی بنیاد سے منتخبہ اینٹ کے ٹکڑوں کو نکال ستونی بنیادوں کو بنایا گیا تھا۔ جس کی تشریح آگے موجود ہے۔

جیسا کہ تذکرہ آیا ہم (مصنفات) 5 اپریل 2003ء تا 26 جولائی 2003ء تک باری باری کھدائی کے وقت موجود تھے۔ کبھی ہم سے کوئی ایک اور کسی وقت دونوں موجود رہے۔ اس وقفہ میں ہونے والی کاروائی کے دوران ہم نے 21 مئی تا 26 جولائی 2003ء کے دورانیہ میں 14 شکایتیں درج کیں، جو کھدائی کی اس کاروائی میں ہونے والی گڑبڑ کے حوالے سے تھیں۔ یہ شکایتیں قانونی عمل کی پیچیدگیوں کے باعث مقدمہ نمبر 4 کے مدعی کے نام سے درج کی گئیں۔ ان شکایتوں میں جن غلطیوں کی جانب نشاندہی کی گئی وہ یہ ہیں۔ گڑھوں کی گہرائی ناپنے میں غلطی؛ محض چند منتخبہ نوادرات کو جمع کرنا؛ ہڈیوں اور چکنی مٹی کے برتنوں اور ٹائل کو نظر انداز کرنا؛ ایک ہی ذخیرہ کے برآمدات کا مختلف اندراج (مثلاً مولڈڈ اینٹیں، مجسمہ کے حصہ، سرخ پختہ مٹی کی مورتیاں ایک ہی سیاق کے تحت درج کی گئیں جبکہ ہڈیاں اور چکنی مٹی کے ٹائل اور برتنوں کو محض ملبہ کی بر آمدات میں درج کر دیا گیا)؛ انسانی کھوپڑی کی ہڈیوں کو رد کیا گیا؛ طبقات الارضی کے مسائل (ایک ہی عمارتی ڈھانچہ کی پرتوں کو الگ الگ زمانی پرتوں کی حیثیت سے درج کیا گیا یہی معاملہ نوادرات کے اندراج کا بھی رہا، جس کے باعث ادوار تاریخ کے تعین میں الجھن پیدا ہوئی)۔ تاہم بیشتر شکایتیں ASI کے ذریعے اینٹوں کے ڈھیر پر مشتمل ستونی بنیادوں کی ''تخلیق'' کے تعلق سے تھیں، جو کئی مواقعوں پر گڑھوں میں بالکل ہی اچھوتی معلوم ہو رہی تھیں۔ مشاہدے کے مطابق، سرخ چونے کے فرش کی کھدائی کے نیچے اینٹ کے ٹکڑوں پر مشتمل نچلی پرت (جیسا کہ اوپر تذکرہ آیا) میں جہاں کہیں بھی درمیان میں پتھر آجاتا، تو کھدائی کرنے والی ٹیم اس پتھر کے اطراف کی چند اینٹوں کو چھوڑ کر بقیہ اینٹوں کو کھدائی میں صاف کر دیتی۔ اور بالآخر بدلتے درمیانی فاصلوں پر چھوڑے گئے ان اینٹوں کے ڈھیروں (جن کے درمیان میں پتھر ہیں) کو ستونی بنیادیں بتایا گیا۔ ہم نے اس تفصیلی مشاہدہ کے بعد شکایتیں درج کیں جس کے ساتھ ڈرائنگس بھی منسلک تھیں۔ (گڑھا نمبر G5,ZF1 ,F2/G2,F3 اور G2)

گڑھوں میں تراشی گئی عمودی سطحوں (Sections) کے مشاہدہ سے بھی منتخبہ اینٹوں کے نکالے جانے (ستونی بنیادوں کو گھڑنے کی خاطر) کا پتہ چلتا ہے۔ اس طرح کی کاروائیوں میں عمودی تراش کی سطح سے اگر چیزیں (اینٹ، پتھر کے ٹکڑے یا دیگر نوادرات) سطح سے آگے نکلتی ہوں تو ان کو توڑ کر ہموار کرنے یا نکالنے کے بجائے، جوں کا توں رہنے دیا جاتا ہے، تاکہ اس تراش کی صحیح تصویر اور اس مواد سے ثقافت کا صحیح اندازہ کیا جاسکے۔ کچھ شکایتوں پر گو توجہ دی گئی لیکن کوئی خاص جواب نہیں دیا گیا۔ دوران کھدائی ASI نے بس اتنا کہا کہ درست ضابطوں کی پابندی کی جارہی ہے۔ ان میں سے کئی دعووں کو کورٹ کے فیصلوں نے مسترد کر دیا۔

ایک اعتراض ہم پر یہ کسا گیا کہ ہم نے روزانہ اندراج کے رجسٹر پر باقاعدگی سے دستخط نہیں کیے۔ درحقیقت ہم نے ایسا جان بوجھ کر کیا (ہمارے لئے لازمی بھی نہیں تھا) کیونکہ ASI کی اس کاروائی اور ستونی بنیادوں کے گھڑنے پر ہمیں سخت اعتراض تھا، اور دستخط کرنے کا مطلب ان کی اس طریقہ کار پر رضامندی دکھانے کا ہوتا۔ دوسرا اعتراض ہماری سائٹ نوٹ بک کے اندراج کے حوالے سے تھا، مگر یہ ایک قابل نظر انداز بات ہے کیونکہ اس میں نتائج (برآمدات) کا اندراج ہوتا ہے، اور طریقہ کار کا کوئی تذکرہ نہیں ہوتا۔ گڑھے F9 میں مشرق کے رخ پر موجود عمودی سطح سے اینٹوں کے ٹکڑے نکالے جانے کے حوالے سے شکایت درج کرنے پر بھی دو مہینے تک کوئی شکایت نہیں لی گئی، جبکہ اس پر روزانہ اندراج کے رجسٹر میں 9 لوگ دستخط کرتے تھے، جس سے ظاہر ہوتا

ہے کہ یہ کاروائی ''خصوصی نگرانی'' میں جاری تھی، نیز ان 9 دستخط کنندگان میں سے کوئی بھی آرکیالوجسٹ نہیں تھے۔ بعد میں بھی اس شکایت کو گڑھوں کی جانچ کی بنیاد پر شامل کیا گیا نہ کہ کھدائی کے مشاہدہ کے حوالے سے۔ایک اور قابل حیرت بات یہ کہ اعلیٰ عدالتی جانچ کے حوالے سے کاروائی میں شفافیت برقرار رکھنے کے لیے دو مشاہدین کو عدالت نے مقرر کیا تھا، مگر ستم یہ کہ دونوں میں سے کوئی بھی آرکیالوجسٹ نہیں تھا، اور کاروائی کے دوران دن کے وقت شاید ہی کبھی وہ دونوں اپنے نشست گاہوں سے نکلتے۔ یہ بھی واضح ہے کہ ستونی بنیادوں کے گھڑے افسانے کے حوالے سے جتنی بھی شکایتیں ہم نے درج کی تھیں، ان تمام کو مجتمع کر کے مبہم انداز میں پیش کیا گیا، بجائے اس کے کہ تمام شکایتوں اور ان کی انفرادیت اور نزاکت کو واضح کیا جاتا۔

ستونی بنیادوں کے افسانے کے سلسلے میں ایک شکایت گڑھے نمبر F3 کے حوالے سے یہاں پیش کی جارہی ہے، جو ہم نے درج کرائی تھی۔ اس سے حتی الامکان قارئین کو اندازہ ہو جائے گا کہ کس طرح کاروائی سے قبل ہی ASI کے کارکنان، ان ستونی بنیادوں کے مفروضے کو حقیقت کی شکل دینے کے خیال سے کام کر رہے تھے۔

26 جولائی 2003ء کو گڑھا نمبر F3 میں ستونی بنیادوں کے حوالے سے درج کی گئی شکایت

پروگریس رپورٹ (22.05.03 تا 05.06.03) میں، گڑھے نمبر F3 میں ایک ایل نما (L Shaped) دیوار کے نیچے ایک دائروی ستون کی بنیاد کا تذکرہ ہے جو اینٹ کے ٹکڑوں پر مشتمل ہے۔ متذکرہ گڑھے میں کھدائی کا کام 6 جون 2003ء کو روک کر اس میں ریت کی بوریاں ڈال دی گئیں۔ 8 جولائی 2003ء کو ان بوریوں کو نکال کر کام دوبارہ شروع کیا گیا۔ تاحال اس گڑھے کو زمینی سطح سے 3.08 میٹر کی گہرائی تک کھودا جا چکا ہے، جو اوپری منزلہ سے 0.95 میٹر کی گہرائی پر موجود ہے۔ کھدائی کی جگہ میں اب تک کوئی صفائی نہیں کی گئی ہے، اور دھول مٹی کی تہوں سے گڑھے میں موجود نوادرات اور دیگر خصوصیات ناقابل امتیاز ہیں۔ کھودے گئے حصے کے جنوب مشرقی کونے میں ایک ایل نما دیوار کا حصہ صاف نظر آتا ہے۔ اسی طرح گڑھے کے شمال مغربی کونے سے بلوا چٹانی پتھر کا ایک فرش نما ٹکڑا اس دیوار سے وتر کے انداز میں ملتا ہے۔ اس فرشی نما ٹکڑے کے بالکل نیچے اور مغربی حصے میں کچھ اینٹ کے ٹکڑے نظر آتے ہیں۔ (شکل نمبر A-2 ملاحظہ کریں جس میں صفائی سے قبل گڑھے کو دکھایا گیا ہے)

8 جولائی 2003ء کی دوپہر تصویر کشی کی غرض سے اس جگہ سے دھول مٹی صاف کی گئی۔ شام 5 بجے تک صفائی کے بعد تمام خصوصیات بالکل واضح ہوگئیں، مگر یہ کام 6 جون 2003ء کو بھی کیا جا سکتا تھا جس دن آخری بار کھدائی ہوئی تھی۔ فرش نمبر 2 جو کہ ابھی کئی ٹکڑوں میں نظر آرہا ہے، اس وقت ایک دائروی شکل میں جنوب مشرقی حصے میں واضح تھا۔ (شکل نمبر B-2 دیکھیں)۔ بقیہ حصے میں اینٹ کے ٹکڑے پھیلے تھے۔

اور وہاں اس وقت ایل نما دیوار کے نیچے اینٹوں سے بنی کسی دائروی ''ستونی بنیاد'' کا وجود نہیں تھا۔ لہٰذا یہ ایک معمہ ہے کہ 22 مئی تا 5 جون 2003ء کی پروگریس رپورٹ میں یہ ستونی بنیادیں کہاں سے آگئیں۔

9 جولائی 2003ء کی صبح 11 بج کر 55 منٹ تک جنوبی نصف حصے سے اینٹ کے ٹکڑے نکالے جا چکے تھے۔ (شکل نمبر C-2 ملاحظہ کریں)۔ اور اگلے 10 منٹوں میں شمال مشرقی حصہ کی جانب سے بھی اینٹ کے ٹکڑے نکال دیے گئے۔ مزید کھدائی کرنے پر فرش نمبر 2 مزید واضح ہوا اور جس جگہ سے یہ فرش ٹوٹا ہوا تھا، وہاں سے نیچے کی جانب اینٹ کے ٹکڑوں کی پرت صاف نظر آرہی تھی۔ (شکل نمبر D-2 ملاحظہ کریں)۔ دوپہر میں فرش نمبر 2 (جو کہ سرخ چونے سے بنا ہوا تھا) کو کاٹنے پر نیچے موجود اینٹ کے ٹکڑوں کی پرت پورے حصے میں مکمل واضح ہو گئی۔ (شکل نمبر E-2 دیکھیں)۔ ایک بار پھر شمال مغربی کونے کے علاوہ جتنے اینٹ کے ٹکڑے تھے وہ سب 4 بج کر 30 منٹ تک صاف کر دیے گئے۔ (شکل نمبر F-2 ملاحظہ کریں)۔ 10 جولائی 2003ء کی صبح کو فرش نمبر 3 سامنے آیا (شکل نمبر G-2 ملاحظہ کریں) جسے دوپہر میں کاٹا گیا۔ دوبارہ جزوی انداز فرش کے نیچے سے اینٹیں نکال کر ایک ''ستونی بنیاد'' جیسا نظر آنے والا نشان تیار کیا گیا۔ (شکل نمبر H-2 ملاحظہ کریں)۔ اور مزید یہ کہ چوکور نظر آنے والی اس ستونی بنیاد کو پروگریس رپورٹ میں دائروی لکھا گیا ہے۔ اور سخت الجھن میں ڈالنے والی بات یہ ہے کہ ستونی بنیاد کی تخلیق سے قبل ہی اس رپورٹ میں اس کے دریافت ہونے کو بیان کر دیا گیا۔ ان سارے واقعات کو سامنے رکھ کر دیکھیں تو شاید ہی کوئی احتمال رہ جائے کہ کس طرح کاروائی سے قبل ہی ASI نے، ان ستونی بنیادوں کے مفروضے کو حقیقت کی شکل دینے کے خیال سے کام کیا۔ حتیٰ کہ کن جگہوں پر ان بنیادوں کو تخلیق کرنا ہے، یہ بھی طئے تھا اور ساتھ ہی اینٹ اور پتھر کے اس ڈھیر کو جس قدر سرعت کے ساتھ ستونی بنیاد کا نام دیا گیا، وہ جلد بازی بھی ظاہر ہے۔

مزید کھدائی پر 11 جولائی 2003ء کو فرش نمبر 3 کے نیچے اینٹ اور پتھر کی Nodules کی ایک سطح برآمد ہوئی۔ اس کے بعد پیٹ کر کثیف کی گئی مٹی کی سطح تھی۔ جس کے نیچے بکھرے ہوئے اینٹ کے ٹکڑوں اور اینٹ کی Nodules تھیں۔ (شکل نمبر I-2 ملاحظہ کریں)۔ 12 جولائی 2003ء کو (زمینی سطح سے 3.9 میٹر کی گہرائی میں) تقریباً تمام حصوں میں اینٹ کے ٹکڑے پائے گئے (شکل نمبر J-2 ملاحظہ کریں)، اور یہ اینٹ کے ٹکڑے مستقل اینٹ کی 21 پرتوں تک گہرے تھے، جو 19 جولائی 2003ء کی کھدائی تک دریافت ہوتے رہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اینٹ کے ٹکڑوں کو ستونی بنیاد ثابت کرنا محض ایک مفروضہ تھا۔ یہ ساری کاروائی ایک متعصّبانہ کاروائی تھی جس میں آرکیالوجی کے اصول و طریقہ کار کو پامال کرتے ہوئے کام کیا گیا۔ لہٰذا اس بات کی درخواست کی جاتی ہے کہ F3 گڑھے میں کسی ستونی بنیاد کے امکان کو خارج کیا جائے۔

اس شکایت کے تناظر میں پہلی مصنفہ پر اس ستونی بنیاد کی تخلیق کی کاروائی کے دوران غیر موجود ہونے کا الزام لگایا گیا، جبکہ جن تواریخ (8 تا 12

شکل 2

گڑھا نمبر F3 میں ستونی بنیادوں کے بنائے جانے کے حوالے سے شکایت کے ساتھ منسلک ڈرائنگس

شکل 4

پہلے مرحلے کی کھدائی میں دریافت، چھوٹی مسجد کا نقشہ

(after Manjhi and Mani 2003: Fig 3A)

جولائی 2003ء) میں یہ ساری کاروائی ہوئی وہ وہاں پر موجود تھیں۔ دوسری جانب 5 جون 2003ء کی سائٹ نوٹ بک اور پروگریسو رپورٹ (22 مئی تا 5 جون 2003ء) میں کسی بھی قسم کی ستونی بنیاد کے واضح ہونے سے پہلے ہی اس کا تذکرہ کر دیا گیا تھا۔ یہ سارا کھیل جسے ہم تقریباً اپریل 2003ء سے دیکھ رہے تھے، اور جس کی ہم نے شکایت درج کی تو بجائے اس کا جواب دینے کے، ہم پر ASI کے خلاف پیشگی معاندانہ محاذ تیار کرنے کا الزام لگایا گیا، جبکہ وہاں ہمارے موجود ہونے کی اصل وجہ، ایک آرکیالوجسٹ کی حیثیت سے محض اس کاروائی کے طریقہ کار کو پرکھنا تھی۔

میری ساتھی مصنفہ کے ذریعے داخل کیے گئے حلف نامہ میں ستونی بنیادوں کے تعلق سے وہ نکات جنہیں فیصلے میں نقل کیا گیا، درج ذیل ہیں۔

ضمیمہ نمبر 4 اور رپورٹ کی تحریر میں ستونی بنیادوں کے تعلق سے نا موافقت؛ ستونی بنیادوں کے محل ووقوع میں کوئی ترتیب کا نہ ہونا؛ گڑھا F6 میں دیوار کو کاٹ کر ستونی بنیادوں کی تخلیق؛ فرش نمبر 2، جس کے نیچے یہ بنیادیں پائی گئیں، فرش ان بنیادوں سے بالکل پیوستہ پایا گیا؛ ستونی بنیادوں کو "تخلیق" کرنے کا براہ راست مشاہدہ؛ اور یہ کہ درحقیقت شمالی حصے میں دریافت ہونے والی بنیادیں ہی اصلاً ستونی بنیادیں ہیں۔ ان نکات میں سے کسی کا بھی جواب نہیں دیا گیا، جب کہ فیصلے میں گڑھا G2 اور F6 میں ان کی مصنوعی تخلیق کے نظریہ پر اتفاق بھی ظاہر کیا گیا ہے۔

اسی سے مشابہ شکایتیں دیگر گڑھوں (ZF1, G5, F3 G2) اور F2 اور G2 کے درمیانی حصے کے تعلق سے بھی کی گئیں، جنھیں قبول ہی نہیں کیا گیا۔

اس کاروائی میں اگر ان ستونی بنیادوں کو الگ کر کے دیکھا جائے تو صرف ایک مغربی دیوار بچتی ہے، جو 1.77 میٹر چوڑی تھی۔ جس میں سرخ چونے کے بنے تین فرش کے نشانات تھے۔

ASI کا اس نتیجہ پر پہنچ جانا کہ مندر موجود ہے، بالخصوص اس وقت جب کہ اُن کا تصوراتی نقشہ، شمالی ہند کی کسی بھی مندر سے مطابقت نہیں رکھتا ہے؛ ایک بہت عجیب بات ہے۔

شمالی ہند کے مندروں میں فرش (کرسی یا Plinth) اطراف کی زمینی سطح سے کافی اونچا ہوتا ہے۔ جس میں سیدھی لمبی دیواروں کے بجائے چھوٹی

شکل 3

رپورٹ کے مطابق ترتیب دیا گیا زیر زمین عمارت کا نقشہ

شمالی ہند کی طرز تعمیر پر مبنی مندر کا ایک علامتی نقشہ

(after Mate 2009: 118)
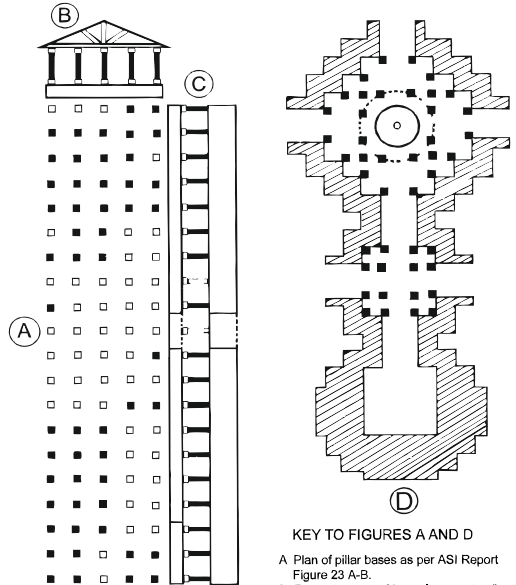
KEY TO FIGURES A AND D

A Plan of pillar bases as per ASI Report Figure 23 A-B.
B Front elevation of "massive structure" -conjectural.
C Side elevation of "massive structure" -conjectural.
D Plan of a typical north-Indian (*nagar*) temple. It has 16 pillars & 28 pilasters. No north-Indian temple would consist of a hundred pillars as made out in Figs. A,B,C here and Figs. 23,23-A, 23-B of the ASI Report.

دیواریں اس طرح ہوتی ہیں کہ اس کا نقشہ صلیب نما شکل کا ہوتا ہے۔ (کرشنا دیوا 1995)۔ ان مندروں میں پہلے ''منڈپا'' ہوتا ہے، یعنی عوامی رسوم کی ادائیگی کے لیے مختص ایک برآمدہ جس میں بہت سارے ستون ہوتے ہیں، جو ''گربھ گرہا'' یعنی اندرونی معبد کے بالکل سامنے ہوتا ہے۔ اگر ایسا کوئی ''منڈپا''، سامنے ہونے کے بجائے بازو میں ہوتو یہ ایک بے معنی بات سمجھی جائے گی، جبکہ ASI کے مطابق درمیانی حصہ (ابھی عارضی مندر کی جگہ) کو گربھ گرہا مان لیا

شکل 5

دوسرے مرحلے کی کھدائی میں مسجد کا نقشہ

(after Manjhi and Mani 2003: Fig 3A)

شکل 6

تیسرے مرحلے کی کھدائی میں مسجد کا نقشہ جس کے شمال میں ایک ستونی تعمیر ہے

(after Manjhi and Mani 2003: Fig 3A)

جائے تو مندر کا بقیہ حصہ (منڈپا کے لئے) مشرق کی طرف ہونا چاہئے تھا، لیکن یہ شمالاً جنوباً پھیلا ہوا ہے۔ (شکل نمبر 3 ملاحظہ کریں)۔ جو عمارتی ڈھانچہ ASI نے دریافت کیا، یہ کسی مندر کا ڈھانچہ نہیں تھا۔ اس بات کی تصدیق پونہ میں دکن کالج کے ریٹائرڈ پروفیسر ایم ایس ماٹے (برائے آرٹ، آرکیٹیکچر اور عہد وسطیٰ کی آرکیالوجی) نے بھی کی۔ (ماٹے 2009:117-119)۔ پروفیسر ماٹے عہد وسطیٰ کے آثار قدیمہ پر گہری نظر رکھتے ہیں، اور اسی موضوع پر کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ دولت آباد کے عہد وسطیٰ کے آثار قدیمہ کی کاروائی آپ ہی کے ذریعے ہوئی ہے۔

شکل نمبر 3 کے مطابق عمارتی ڈھانچہ میں مغربی دیوار کا انتہائی واضح ہونا، مسجد کی نشانی ہے۔ یہ مغربی دیوار، مشرق کے رخ پر ہلکی ٹیڑھی ہے جو مکہ کے رخ پر قبلہ کی نشاندہی کرتی ہے۔ آرکیالوجی کی کاروائی سے حاصل شدہ معلومات کے مطابق اس مقام پر کسی مندر کے بجائے مسجد کے تعمیری ڈھانچہ کی دریافت زیادہ قرین قیاس ہے۔ بارہویں صدی کے اواخر اور تیرھویں صدی کے اوائل میں وہاں ایک مسجد کی تعمیر کے نشانات ہیں، جس کا فرش پالش کیے ہوئے سرخ چونے سے بنا تھا (فرش نمبر 4)۔ وہاں قریب آدھے میٹر اونچائی کی ایک احاطہ کرتی ہوئی دیوار تھی (گڑھا E6 سے ZE1 کی طرف اور مشرق میں H سیریز کے گڑھوں کی طرف) یعنی شمالاً۔ جنوباً 28 میٹر اور مشرق۔ مغرب 16 میٹر کا احاطہ۔ اس احاطہ میں غالباً ایک چھوٹا سا درمیانی حصہ چھت والا رہا ہوگا، جس کی مغربی دیوار کا شمالی حصہ، گڑھے F2 میں ایک Niche کے ساتھ نظر آرہا ہے۔ یہ دیوار کافی پتلی (0.35-0.4 میٹر) تھی۔ (شکل نمبر 4 ملاحظہ کریں)۔ بنا بنیاد کی پتلی دیواروں پر مشتمل یہ ایک کمزور حصہ تھا۔ جس کے گر جانے پر اسے اینٹ کے ٹکڑوں، پتھر کی پرتوں، اینٹ کے Nodules اور کیچڑ سے بھر دیا گیا ہوگا تاکہ اگلے مرحلے کا فرش بنایا جا سکے۔ جو شمالاً جنوباً ٹیلے کے کناروں تک اور مشرق میں J سیریز کے گڑھوں تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ فرش نمبر 3، جو شمالاً جنوباً 60 میٹر لمبا اور 20 میٹر چوڑا تھا۔ (شکل نمبر 5 ملاحظہ کریں)۔ اس فرش کے ڈھہ جانے پر تیسرے مرحلہ میں ایک اور فرش (فرش نمبر 2) بنایا گیا ہوگا جس کو مشرق میں مزید لمبا یعنی L سیریز کے گڑھوں تک بنایا گیا ہوگا۔ چوڑائی 30 میٹر۔ (شکل نمبر 6 ملاحظہ کریں)۔ اور آخری مرحلہ میں ستونوں پر مشتمل ایک ڈھانچہ، شمالی حصہ میں بنایا گیا ہوگا۔ جس کے شمالی ستونوں کی بنیادوں کسی حد تک محفوظ رہیں۔ بعد کے دو فرش خراب معیار اور مختلف احاطوں تک نظر آئے۔

اکثر جو نکتہ اٹھایا جاتا ہے کہ مسلم فریقین کے مطابق بابری مسجد ایک خالی زمین پر بنائی گئی تھی نہ کہ کسی مسخ شدہ عمارتی ڈھانچہ پر۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اب زیر زمین کسی اسلامی عمارت کی موجودگی کا دعویٰ اور شواہد پیش نہیں کئے جا سکتے۔ جبکہ اس کے برخلاف ہندوؤں کی جانب سے مسجد کے نیچے موجود مندر کی عمارت کا مستقل ڈھول پیٹا گیا تھا، لہٰذا اب، جب کہ کوئی عمارتی ڈھانچہ برآمد ہوا تو اسے مندر ہی ہونا چاہیے۔ لیکن یہ نکتہ قطعاً غیر مناسب ہے، اور زیادہ مناسب بات یہ ہے کہ کسی تاریخی روایت کی موجودگی یا غیر موجودگی کے اثرات آثار قدیمہ کی شواہد پر نہیں پڑ سکتے۔ ماہرین آثار قدیمہ اور تاریخ دانوں کے درمیان یہ بات حد درجہ مانی گئی ہے کہ آثار قدیمہ زبانی روایتوں اور تاریخی تحریروں کے اثبات یا انکار کا محض ایک ذریعہ ہے۔

چنانچہ شواہد کی روشنی میں مندر کی موجودگی کے آثار موجود نہیں ہیں، اس کے باوجود بھی اس تصور کے علاوہ کسی اور تصور کو قبول نہیں کیا جا رہا ہے۔

یہاں ایک اور ڈھانچہ کا تذکرہ بے جا نہیں ہوگا، جسے ASI نے اپنی نظریہ کے حق میں پیش کیا ہے۔ یہ ایک چھوٹا دائرہ نما ڈھانچہ ہے، ASI نے ایک مندر بتایا اور کہا کہ اس کے اطراف دسویں صدی عیسوی میں ہندو اپنی رسومات ادا کرتے تھے۔ (شکل نمبر 7 اور 8 ملاحظہ کریں)۔ یہ اینٹوں دائروی تعمیر اینٹوں سے کی گئی ہے، جس کا باہری قطر 1.66 میٹر ہے۔ جس کے مشرقی رخ پر ایک مستطیل نما حصہ 32.5 سم باہر کو نکلا ہوا ہے۔ ASI کے مطابق یہ عمارت کا داخلی دروازہ کا حصہ رہا ہوگا، مگر یہ ناممکن ہے کیونکہ اس کی چوڑائی 45 سم سے بھی کم ہے۔ یہ بھی بتایا گیا کہ اندرونی حصہ چوکور رہا ہوگا، (Manjhi and Mani 2003:70) مگر ڈرائنگ (شکل نمبر 7) میں جس طرح نقطہ دار خط سے اس حصہ کو واضح کیا گیا ہے، یہ نقطہ دار خط کا مطلب آرکیالوجی میں محض قیاس یا خیال پر مبنی حصہ ظاہر کرتا ہے۔ ASI نے ایک پرنالہ کا بھی تذکرہ کیا جو دیویوں کو نہلانے کے بعد پانی کی نکاسی کے لیے بنایا گیا ہوگا۔ اس خیال کے مطابق اسے شیو کا مندر (شیولنگ کو دائرے کے بیچ تصور کرتے ہوئے) ہونا چاہئے تھا۔ مگر چونکہ یہ ایک ٹھوس دائروی تعمیر ہے لہٰذا نہلانے کی رسم کے لئے داخل ہونے کا سوال ہی نہیں۔ اور پرنالہ بتائے گئے حصہ کے ڈھلوان کو جب رتنا گر اور منڈل نے اسپرٹ کے بلبلہ سے ناپا (Mandal 2007:42) تو ڈھلوان سطح پانی کی نکاسی کے لئے ناکافی معلوم ہوئی۔ ASI نے اس دائروی مندر کو مابعد گپتا۔ راجپوت (9ویں اور 10ویں صدی) کا بتایا ہے جب کہ پرتوں کے مشاہدہ اور سائٹ نوٹ بک کے

شکل 7

دائرہ نما عمارت کا نقشہ

شکل 8

دائرہ نما عمارت کا اوپری نظارہ (after Manjhi and Mani 2003: Fig 24)

مطابق یہ گپتا عہد یعنی چوتھی تا چھٹی صدی کے درمیان کا ڈھانچہ تھا۔

کھدائی کرنے والے نے واضح طور پر سائٹ نوٹ بک میں لکھا ہے کہ اس دائروی ڈھانچے کی دیواریں گپتا عہد کی ہیں۔ جسے ASI نے جان بوجھ کر اپنی رپورٹ میں چھپانے کی کوشش کی، اور اپنے مفروضہ کے حق میں دلائل کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی۔ یہ چھیڑ چھاڑ سائٹ نوٹ بک کے مطالعہ کے بغیر شاید سامنے بھی نہ آتی، جسے حتمی رپورٹ کی طرح فریقین کو فوراً مہیا نہیں کرایا گیا تھا۔

دلچسپ بات یہ کہ جسٹس سدھیر اگروال نے دائروی مندر کو ریڈیو کاربن ڈیٹنگ AD 900-1030 کی بنیاد پر (پیراگراف 3937 میں) نویں اور دسویں صدی کا نوٹ کیا، حالانکہ رپورٹ میں اس حصے کی کسی ریڈیو کاربن ڈیٹنگ کا تذکرہ ہی نہیں۔ رپورٹ کی جانچ کرنے پر ہمیں پتہ چلا (Manjhi and Mani 2003:69) کہ شمال میں موجود گڑھا نمبر ZH1 کے نمونوں کی کاربن ڈیٹنگ کی بنیاد پر یہ تاریخ طئے کی، جبکہ دائروی مندر جنوب میں موجود E8 اور F8 سے برآمد ہوا ہے۔

عدالتی فیصلے میں ASI کے موازنہ کا بھی حوالہ موجود ہے، جو ASI نے دائروی مندر کے تعمیری اسلوب کی بنیاد پر دیگر چند اینٹ کے مندروں سے کیا ہے۔ جن میں ریوا نامی علاقے کے قریب سراوستی، چندریہے، مساون مندر شامل ہیں، اور فتح پور ضلع میں کُراری اور ٹنڈولی۔ کم از کم کُراری مندر کے تعمیری اسلوب کا معائنہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس کا پلان، 16 ضلعوں پر مشتمل ایک کثیر ضلعی سے مشابہ ہے، جس میں 3 اضلاع کی جگہ ایک سیدھی خط سے عمارت کا سامنے کا رخ بنتا ہے۔ (Vogel 1908-09:20)۔ اور یہ دریافت شدہ دائروی عمارت سے یکسر مختلف ہے کیونکہ اس دائرہ نما عمارت میں کہیں کوئی ضلع عمارت کا رخ نہیں بناتا۔ مزید جن عمارتوں کا نام موازنہ کی غرض سے دیا گیا ہے، وہ تمام عمارتوں کے قطر کم از کم دوگنا سے چارگنا تک ہیں، لہٰذا قد و قامت کے اعتبار سے اس کا موازنہ درست ہی نہیں۔ دیئے گئے ناموں میں تمام عمارتیں بڑی اس لئے ہیں کیونکہ یہ اندر سے خالی اور قابل استعمال ہیں، جس میں داخل ہوا جا سکتا ہے۔ جبکہ دریافت شدہ دائروی عمارت، جو ٹھوس اور اینٹوں سے بھری ہے (شکل 7 و ر 8)، ہمارے مشورہ کے مطابق یہ ایک ''منتی استوپا'' (Votive Stupa) ہوگا۔ شکل نمبر 8 کے مطابق اس عمارت میں اینٹ کی نچلی پرتیں زیادہ قطر کے ساتھ باہر کو نکلی ہیں۔ یہ فرق استوپا کے دو حصوں، میدھی (نچلا ڈرم نما حصہ) اور انڈا (اوپر کا نصف کرہ نما حصہ) سے بہت مشابہ ہے، اور مستطیل نما حصہ جو باہر کو نکلا ہوا ہے وہ گوتم بودھ کے مجسمہ کے لئے ایک طاق ہو سکتا ہے۔

ASI کی اسٹیٹسٹ آرگنائزیشن Statist Organisation

بیشتر آرکیالوجسٹ، اس بات پر اتفاق رکھتے ہیں کہ آرکیالوجی یا علم آثار قدیمہ کا رول، تاریخی روایتوں کا اثبات یا انکار کرنا ہے۔ مہابھارت اور رامائن جیسے آرکیالوجی کے پراجیکٹس کا مقصد بھی یہی تھا۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ تاریخی عہد کے متعلق تاریخی روایتوں اور آرکیالوجی کے شواہد دونوں کو بیک وقت نہ دیکھا جائے۔ لیکن یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ دونوں کے بیانیوں میں بڑے اختلافات ہو سکتے ہیں اور ان اختلافات کی پیچیدگیوں کو سمجھنا ضروری ہے۔ مثلاً رزمیہ داستانوں کے حوالے سے خود برصغیر میں مختلف روایتیں پائی جاتی ہیں۔ مزید یہ کہ پہلے یہ زبانی روایتوں کے طور پر منتقل ہوتی رہی ہیں، بعد میں انہیں جمع کر کے ایک طویل عرصہ کی تاریخ کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس تناظر میں واقعات کی زمانی ترتیب کا یقینی ہونا بھی بہت مشکل ہوتا ہے۔ بہت قدیم تواریخ، مختلف سماجی طبقات کی زبانی منتقل ہونے کے باعث بھی حقائق کے معاملے میں مشکوک ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا کسی تاریخی روایت کے واقعات کو آرکیالوجی کے شواہد کے ساتھ ہم آہنگ کرنا ایک بیکار کام ہے۔ مثال کے طور پر بھاردواج آشرم کے مقام پر کچے مکانات کے جو باقیات ملے، ان کی بنیاد پر یہ کہا گیا ہے کہ رام، لکشمن اور سیتا جمنا ندی پار کرنے سے پہلے وہاں ٹھہرے ہوں گے۔ (Lal 2002:41-42, 45-48)

ASI کی کاروائیاں، تاریخی روایتوں پر ایمان لاتے ہوئے انجام پاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ مزید یہ کہ ASI کے کھدائی اور ریکارڈ کرنے کے طریقے آج بھی پرانے انداز کے ہیں جس میں مختلف زمانوں کی ثقافتی ترتیب قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، جسے 1940ء میں مرٹائمر وہیلر نے متعارف کرایا تھا۔ جبکہ گذشتہ 50 سالوں میں بھارت کے مختلف تعلیمی اداروں میں اور بھارت کے باہر بھی نت نئے اور بہتر طریقے سامنے آئے ہیں۔ یہ ASI کی علمی پسماندگی کی دلیل

ہے، اور ظاہر کرتا ہے کہ ASI کے آرکیالوجسٹ، سرکاری کارندے ہی ہیں۔ چونکہ ASI مرکزی سرکار کو جوابدہ ہے، لہٰذا اس بات کو کلیتاً جھٹلایا بھی نہیں جاسکتا۔

ایودھیا میں ASI کی اس کاروائی اور رپورٹ پر کئی ماہرین آثار قدیمہ سخت تنقید بھی کرنا چاہتے ہیں۔ مگر چونکہ ASI ملک کے وراثتی نظم و ضبط Heritage Management پر مکمل کنٹرول رکھتی ہے، اور کوئی آرکیالوجسٹ اس کے اجازت نامے کے بغیر کام نہیں کر سکتا، لہٰذا وہ خود کو مجبور محسوس کرتے ہیں۔

سونے پہ سہاگا، دیکھئے کہ جسٹس اگروال نے درج بالا نکتے کو ASI کی مہارت کے بیان کرنے کے لئے استعمال کیا۔ پیراگراف 3879 میں وہ لکھتے ہیں ''وہ (ASI) ماہرین کے سردار ہیں۔ لہٰذا کوئی بھی آرکیالوجسٹ ان کے اجازت نامے کے بغیر کسی بھی تاریخی اہمیت کی حامل مقام پر آثار قدیمہ کی کاروائی انجام نہیں دے سکتا۔'' مزید لکھتے ہیں ''اس میدان میں کسی بھی کاروائی کے مشاہدات، نتائج اور بیانیہ اس وقت تک تسلیم نہیں کئے جاتے جب تک کہ وہ ASI کے ماہر سے تصدیق شدہ ہوں یا اس کے علمی جریدہ میں شائع ہو جائیں۔''

جب کہ جو بھی علمی کام ASI کی جانب سے کیا گیا ہے، اس کی اہمیت بھارت اور دیگر ملکوں میں سماجی علوم کے حوالے سے انتہائی کم ہے۔ خود ASI کی آثار قدیمہ کے میدان میں علمی کام میں دلچسپی اور پیش رفت بہت معمولی ہے۔ ہر سال ASI کے زیر نگرانی ہونے والی کاروائیاں محض اس لئے ہوتی ہیں کیونکہ بجٹ میں ان کا حصہ مختص ہے، جسے تصرف میں لانا ہوتا ہے (Chaddha 2007)۔

اور ASI کی کھدائی کی کاروائیوں پر ایک اسسٹنٹ سپریٹینڈنگ آرکیالوجسٹ کا فقرہ دیکھیے کہ یہاں سب کچھ ہے مگر تحقیق نہیں۔ سب کچھ جیسے پیسہ، سیاست، تعصب، کرپشن، عوامی شہرت، ذاتی فوائد۔ تحقیق ان سب کے لئے بس ایک کتبہ ہے۔ آپ کسی بھی آرکیالوجسٹ سے جا کر تحقیق کے بارے میں پوچھئے، آپ خود جان جائیں گے۔'' (Chaddha 2007:247)

REFERENCES

Chadha, A (2007): "Performing Science, Producing Nation: Archaeology and the State in Postcolonial India", PhD Thesis, Stanford University, Stanford.

Cunningham, A (1871; Reprint 2000): *Four Reports Made During the Years 1862-63-64-65*, Vol I, Archaeological Survey of India, New Delhi.

IAR, *Indian Archaeology: A Review 1969-70*, Archaeological Survey of India, New Delhi, pp 40-41.

IAR, *Indian Archaeology: A Review 1976-77*, Archaeological Survey of India, New Delhi, pp 52-53.

IAR, *Indian Archaeology: A Review 1979-80*, Archaeological Survey of India, New Delhi, pp 76-77.

Krishna, Deva (1995): *Temples of India,* Vol I (New Delhi: Aryan Books).

Lal, B B (1998): "A Note on the Excavations at Ayodhya with Reference to the Mandir-Masjid Issue", www.wac.uct.ac.za/croatia/lal.htm, accessed on 10 August 2002.

– (2002): "Historicity of the *Mahabharata* and the *Ramayana*: What Has Archaeology to Say in the Matter?" in S Settar and R Korisettar (ed.), *Archaeology and Historiography, History, Theory and Method, Indian Archaeology in Retrospect*, Vol IV, (Delhi: ICHR and Manohar), pp 29-56.

Mandal, D (2007): "An Analysis of the ASI Report" in D Mandal and S Ratnagar, *Archaeology after Excavation* (New Delhi: Tulika), pp 25-100.

Manjhi, H and B R Mani (2003): *Ayodhya: 2002-03*, Vols I and II, Archaeological Survey of India, New Delhi.

Mate, M S (2009): "Book Review of Ayodhya: Archaeology after Excavation", *Man and Environment,* XXXIV(1), pp 117-19.

Panikkar, K N (1991): "A Historical Overview" in S Gopal (ed,), *Anatomy of a Confrontation – The Babri Masjid-Ram Janmabhumi Issue* (New Delhi: Penguin), pp 22-37.

Ramjanmabhoomi-Babri Masjid Judgement, High Court of Allahabad, www.rjbm.nic.in.

Robillard, C, M Kumar and R Rishi (2003): "Final Report on GPR Survey of the Disputed Site in Ayodhya", Tojo-Vikas International, New Delhi.

Vogel, J Ph (1908-09): "The Temple at Bhitargaon", *Archaeological Report of the Archaeological Survey of India*, Archaeological Survey of India, New Delhi, pp 5-21.

افکارِ مودودیؒ کی عصری معنویت

ڈاکٹر محمد رفعت

(یہ تقریر، ایس آئی او شانتاپورم کیرلہ کے زیر اہتمام منعقد کانفرنس میں نومبر ۲۰۱۷ء میں کی گئی۔)

یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے کہ ہم سب کو ایک اہم پروگرام میں شرکت کا موقع مل رہا ہے۔ ہم اس پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ میں اس پروگرام کے منتظمین کا بھی بہت مشکور ہوں جنھوں نے یہاں آنے کا موقع دیا تاکہ کچھ باتیں اس اہم عنوان پر آپ کے سامنے رکھی جاسکیں۔

جیسا کہ آپ کے سامنے اعلان ہو چکا ہے پوری کانفرنس کا بھی ایک مرکزی موضوع ہے۔ یعنی ''ریوزٹنگ مودودی: تفہیم تجدید تعمیر''۔ (مولانا مودودیؒ کا ازسرنو مطالعہ) اس مطالعے کے نتیجے میں یہ توقع کی گئی ہے کہ بہتر تفہیم ہو سکے گی اور پھر اس کے بعد اس فکر کی تجدید نو کی طرف بھی ہم کچھ قدم بڑھا سکیں گے۔

فکر اسلامی

محترم دوستو! اس مرکزی موضوع کے تحت اس وقت جو بات پیش کرنی ہے اس کے لیے ذیلی موضوع رکھا گیا ہے ''عصر مودودی میں فکر مودودی کی معنویت''۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ۱۹۰۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۷۹ء میں آپ کا انتقال ہوا۔ گویا بیسویں صدی کے بڑے حصہ پر آپ کی زندگی محیط ہے اور اسی کو ہم مولانا مودودیؒ کا عصر (زمانہ) کہہ سکتے ہیں۔ وہ زمانہ اپنے منفرد تاریخی عوامل اور تہذیبی حالات سے عبارت ہے۔

جس فکر کی طرف ہمیں توجہ کرنی ہے اور جس کا پیغام خود سمجھنا ہے اور دنیا کے سامنے پیش کرنا ہے وہ کسی ایک شخص کی فکر نہیں ہے بلکہ وہ فکر اسلامی ہے۔ یعنی وہ فکر جس کی بنیاد اللہ تعالیٰ کے نازل کیے ہوئے دین پر ہے۔ اس کو سمجھنے اور اس کی تشریح کرنے میں ہمارے اہل علم نے اہم رول ادا کیا ہے۔ اس کی مستند تشریح خود نبی کریمؐ فرمائی ہے۔ اس کے بعد امت کی ہر نسل اسلامی فکر کو سمجھنے کی، اسے ترقی دینے کی اور اس کا انطباق کرنے کی کوشش کرتی رہی ہے۔ امت کے اہل علم میں سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ بھی ہیں۔ فکر مودودی کوئی صحیح اصطلاح نہیں بلکہ مقصود فکر اسلامی ہے، جس کو ہمیں سمجھنا اور فروغ دینا ہے اور دنیا کے سامنے پیش کرنا ہے۔ ہر صاحب علم کی طرح سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے بھی بڑا کارنامہ انجام دیا۔ انھوں نے اسلامی فکر کو سمجھنے، اس کو فروغ دینے اور اس کی تشریح کرنے میں اپنا حصہ ادا کیا۔

ہر انسان جو رسول نہ ہو اس کی فکری اور عملی کوششوں میں غلطیاں ہو سکتی ہیں، اس کا امکان موجود ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ہم کو وہ طریقہ بتایا ہے جس سے ہم غلطیوں سے بچ سکتے ہیں اور کم زوریوں پر قابو پا سکتے ہیں۔ وہ طریقہ یہ ہے کہ ہر شخص کی باتوں کو قرآن وسنت کی کسوٹی پر پرکھا جائے گا۔ صرف نبی کریمؐ کی جو

تشریح ہے وہ خود مستند ہے۔ وہ خود معیار ہے، مگر باقی ہر شخص کی باتیں اس لائق ہیں کہ انھیں پرکھا جائے، جانچا جائے اور اسی معیار پر ان کا جائزہ لیا جائے۔

موجودہ زمانے میں سید ابوالاعلیٰ مودودی کا اکثر تذکرہ ہوتا ہے اور ان کا نام اسلام کے ترجمان اور نمائندہ کی حیثیت سے لیا جاتا ہے۔ مولانا مودودیؒ کے جو لوگ قدرداں ہیں ان کے لیے یقیناً یہ خوشی کی بات ہے۔ لیکن پچھلے پچیس سال سے یہ جو تعارف مولانا مودودیؒ کا کرایا جاتا ہے (بحیثیت اسلام کے داعی، ترجمان اور نمائندے کے) وہ بطور تحسین نہیں ہوتا بلکہ دنیا کے ذرائع ابلاغ میں مولانا تنقید کے نشانے پر ہیں۔ متعین طور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ اسلام کے نام پر جو بعض نا مناسب حرکتیں دنیا میں ہو رہی ہیں تو ان حرکتوں کی ذمہ داری مولانا مودودی کے لٹریچر اور فکر پر عائد ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے مولانا مودودیؒ کا ذکر ہوتا ہے ان کے ساتھ سید قطبؒ کا بھی ذکر ہوتا ہے۔ اور باقی مسلمان مفکرین اور علماء کا ذکر ان کے مقابلے میں بہت کم ہوتا ہے۔ اس منفی پہلو کے اعتبار سے سوال کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی طرف منسوب نامناسب حرکتوں کی ذمہ دار کون سی فکر ہے اس کے جواب میں عام طور پر دو نام سید مودودیؒ اور سید قطبؒ کے پیش کیے جاتے ہیں۔

مولانا مودودیؒ کے افکار اور خیالات اور فکر اسلامی کے فروغ میں ان کے حصہ پر کچھ عرض کرنے سے پہلے یہ بات مناسب معلوم ہوتی ہے کہ ہمارے ذہن میں یہ بات تازہ ہو جائے کہ خود فکر سے ہم کیا مراد لیتے ہیں۔

فکر کے معنیٰ

انسان کا حال یہ ہے کہ وہ مسلسل عمل کرتا رہتا ہے۔ جب تک وہ زندہ ہے وہ کام کرتا ہے اور اس کے ساتھ اس کا ذہن سوچتا بھی رہتا ہے۔ ہاتھ پیر کام میں مصروف ہوتے ہیں اور انسان کا ذہن اور دماغ سوچنے کا کام کرتا رہتا ہے۔ لیکن دنیا میں ایک بڑی تعداد لوگوں کی ایسی ہے جن کے خیالات میں کوئی ترتیب نہیں ہوتی۔ کبھی کوئی خیال ان کے دل میں آتا ہے کبھی کوئی دوسرا آجاتا ہے۔ زیادہ تر وہ دنیا کے چلن کی پیروی کرتے ہیں۔ دنیا میں جو باتیں ہو رہی ہیں وہی ان کے ذہن میں گونجتی ہیں۔ دنیا میں جو کچھ کہا جاتا ہے اس سے وہ متاثر ہوتے ہیں۔ ان کے خیالات کسی ترتیب اور نظم سے خالی ہوتے ہیں۔ ایسے خیالات کو ہم فکر نہیں کہہ سکتے۔

فکر اس کا نام ہے کہ خیالات اور افکار، ایک ترتیب اور نظم کے ساتھ انسان کے ذہن میں ہوں اور پھر وہ ان کو پیش بھی کرے اور اسی کی بنیاد پر اس کا عمل ہو۔ اس سلسلے میں جو بات آپ ایک فرد کے بارے میں کہتے ہیں وہی بات آپ ایک گروہ کے بارے میں کہہ سکتے ہیں۔ ایک اجتماعی گروہ، ایک قوم یا ایک جماعت کے بارے میں بھی یہی بات کہی جاسکتی ہے کہ اس کے عمل کے پیچھے خیالات ہوتے ہیں۔ لیکن اگر وہ خیالات منظم ہوں ان کے اندر ایک ترتیب ہو، ان کے اندر ایک نظم ہو تو اسے فکر کہا جائے گا اور منظم فکر کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔

وہ لوگ جن کے خیالات میں کوئی ترتیب نہ ہو کوئی شعور نہ ہو ان کے کام دنیا پر کوئی خاص اثر نہیں ڈالتے۔ وہ محض زندگی گزارتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ دنیا پر جن لوگوں نے کوئی خاص اثر ڈالا ہے وہ وہی لوگ ہیں جن کے پاس فکر موجود ہے۔ جن کا شعور تازہ ہے، جن کے ذہن میں یہ واضح ہے کہ وہ کس بات کو صحیح سمجھتے ہیں اور کس بات کو صحیح نہیں سمجھتے اور اس شعور کے مطابق وہ اپنے عمل کی راہیں تلاش کرتے ہیں۔

دینی فکر

اب اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے آپ دینی فکر کے بارے میں سوچ سکتے ہیں۔ دنیا میں افکار و خیالات تو اور بھی بہت سے ہیں جن میں نظریات، فلسفے اور مختلف پروگرام شامل ہیں، جو سماجی اور سیاسی تحریکوں نے پیش کیے ہیں اور ہر ایک کے پاس کچھ نہ کچھ فکر ہوتی ہے۔ لیکن جو دینی فکر ہے اور خاص طور پر جو اسلامی فکر ہے اس کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں جو بنیادی بات پیش کی جاتی ہے، وہ انسانی استدلال کی بنیاد پر نہیں پیش کی جاتی۔ انسانی استدلال کا بھی اس میں ایک مقام ہے لیکن بعد میں ہے۔

اصلاً دینی فکر کی بنیاد انسانوں کی پیش کی ہوئی کوئی دلیل نہیں ہے۔ بلکہ اللہ کی نازل کردہ ہدایت ہے۔ دینی فکر میں اور فلسفیانہ اور نظریاتی فکر میں یہ جو بنیادی فرق ہے یہ ہمارے سامنے رہنا چاہئے۔ نظریاتی اور فلسفیانہ فکر وہ ہے جو کسی انسان نے پیش کی اور اس نے دلائل بھی خود ہی فراہم کیے۔ اس فکر کو صحیح ثابت کرنے کے لیے کچھ باتیں پیش کیں۔ لیکن دینی فکر کسی انسان کی ایجاد کردہ نہیں ہے بلکہ اللہ کی ہدایت پر مبنی ہے۔ اس کے جو دلائل ہیں وہ بھی وہی ہیں جو اللہ کی نازل کردہ تعلیم کے اندر موجود ہیں۔ اس فکر کی تشریح ہر صاحب علم اور ہر ایمان لانے والا اپنی زبان میں کرتا ہے، اپنے حالات کے سیاق میں کرتا ہے لیکن اس کی بنیاد بہر حال ہدایت الٰہی پر ہوتی ہے۔

اب ہمارے سامنے سوال آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت تو آ گئی۔ کتاب الٰہی موجود ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اس کی جو تشریح کی وہ بھی موجود ہے۔ آپؐ کی سیرت کی شکل میں، آپ کی حدیثوں کی شکل میں اور صحابہ کے مجموعی کام کی شکل میں۔ پھر اس کے بعد کیا ضرورت پیش آتی ہے کہ قرآن، حدیث، سیرت پاک، سیرت صحابہ کے موجود ہوتے ہوئے ہم فکر اسلامی کی از سر نو تشریح کریں اور ہر نسل کے اندر یہ کام انجام پائے۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ اس کی ضرورت اس لیے اس لیے پیش آتی ہے کہ فکر کے بعض پہلو ایسے ہوتے ہیں جن کو بار بار اور از سر نو بیان کرنا ہوتا ہے۔ اگر اس سلسلے میں غور کیا جائے تو ہم تین پہلوؤں کی نشان دہی کر سکتے ہیں۔ ایک پہلو بنیادی ہے۔ اسلام کے پیغام کی بنیاد ایمان لانے پر ہے۔ آدمی اللہ پر ایمان لائے اور اس کے رسولوں پر اور حساب کے دن پر یعنی توحید و رسالت و آخرت پر۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں جہاں ایمان لانے کو دعوت دی ہے وہیں اس کے حق میں استدلال بھی پیش کیا ہے۔

ایمانیات سے دلائل

آدمی توحید پر کیوں ایمان لائے؟ اللہ کو ایک کیوں مانے؟ تنہا اسی کی

عبادت کیوں کرے؟ شرک سے کیوں بچے؟ اس پر مفصل کلام کیا گیا ہے۔ اسی طرح معاملہ رسالت کا ہے۔ نبی کو کیسے جانچا جائے کہ اس کا دعویٔ نبوت صحیح ہے؟ کس بنیاد پر ہم ایمان لے آئیں؟ اسی طرح آخرت کا امکان کیا ہے؟ آخرت کی ضرورت و حکمت کیا ہے؟ یہ سارے موضوعات وہ ہیں جو قرآن کریم میں بیان ہوئے ہیں۔

چنانچہ یہ پہلو ہے جس میں ہم فکر اسلامی کے بیان اور تشریح کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ یعنی جو استدلال قرآن مجید میں پیش ہوا ہے جس کی تشریح نبی ﷺ نے فرمائی ہے، اس کو ہم اپنی زبان میں پیش کریں ہر نسل کے سامنے۔ آپ نے قرآن پڑھا، حدیث میں اس کی تشریح پڑھی۔ اب اپنے حالات اور زبان میں، اپنے مقام پر اس سارے استدلال کو دوبارہ پیش کریں۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ باتیں یعنی توحید کی دلیل کیا ہے۔ وغیرہ۔ یہ محض دعوت سے تعلق رکھتی ہیں، یعنی کسی شخص سے جو دائرہ اسلام میں نہیں ہے، اس سے ہم بات کر رہے ہیں تب ضروری ہے کہ توحید کی دلیل بیان کریں، لیکن ایسا نہیں ہے۔

قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمانیات کے حق میں استدلال کے دو مقصد ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ دعوت سننے والا جان لے کہ یہ پیغام کیوں صحیح ہے، لیکن اس کا دوسرا مقصد بھی ہے وہ یہ ہے کہ ایمان لانے والوں کے ایمان کو تازہ کیا جائے۔ دلائل کی ضرورت صرف ان لوگوں کو نہیں ہے جو دین سے ناواقف ہیں بلکہ وہ بھی جو ایمان لانے کے بعد مسلمان ہیں ان کو بھی ضرورت ہے کہ توحید، رسالت اور آخرت کے دلائل ان کے سامنے آئیں بار بار۔ تاکہ ان کا ایمان تازہ ہو۔

اس معاملے میں ایک بات اور ہمارے سامنے ہوتی ہے اور وہ بات یقیناً بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ قرآن مجید کا ایک استدلال ہے یعنی اس نے اپنے پیغام کی دلیل پیش کی اور ایک اس کا طرز استدلال ہے۔ یعنی استدلال کا طریقہ۔ طریقہ یہ ہے کہ جو کچھ انسان دیکھتا ہے، جو کچھ انسان جانتا ہے اور جو کچھ انسان مشاہدہ کرتا ہے اس سے قرآن انسان کو ان حقائق تک لے جاتا ہے جس کا مشاہدہ وہ نہیں کرتا۔ جو کچھ ہم دنیا میں دیکھتے ہیں، زمین، آسمان، سورج، چاند، ستارے اور انسان، یہ سب اللہ کی قدرت اور حکمت کی نشانیاں ہیں۔ نشانیاں تو ہم دیکھتے ہیں مگر جن حقائق کی طرف نشانیاں اشارہ کر رہی ہیں وہ حقائق ہمیں نظر نہیں آتے۔

قرآن کا طرز استدلال یہ ہے کہ بہر حال مشاہدہ کا انکار آدمی نہیں کر سکتا۔ جو کچھ اسے نظر آتا ہے ہم سب اسے مانتے ہیں۔ اس مشاہدے سے آغاز کر کے، قرآن، جو حقائق چھپے ہوئے ہیں، غیب میں ہیں، ان کے حق میں دلیل پیش کرتا ہے۔ اس استدلال کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ قرآن انسان کی فطرت کو جگاتا ہے۔ انسان کی فطرت جانتی ہے بہت ساری باتوں کو۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے صحیح فطرت پر پیدا کیا ہے۔ فطرت کو جگا کر بتاتا ہے کہ جو بات تم جانتے ہو، اسی کو مان لو۔ تم یہ جانتے ہو کہ تم غیر ذمہ دار نہیں ہو۔ مان لو کہ آخرت آئے گی۔ تم یہ جانتے ہو کہ تمہاری عقل ہدایت کے لیے کافی نہیں ہے تو نبیوں پر ایمان لاؤ، تم یہ جانتے ہو کہ تمہارا خالق اور مالک ایک ہی ہے تو شکر اسی کا ادا کرو۔

اب ہوتا یہ ہے کہ دنیا کے جو فلسفے اور نظریے ہیں ان کا طرز استدلال ذرا دوسری قسم کا ہے۔ مثال کے طور پر آج کی دنیا کا مقبول طریقہ جسے ہم سائنسی طرز استدلال کہتے ہیں۔ اس میں اور قرآنی طرز استدلال میں بعض باتیں ایک جیسی ہیں، مگر بعض باتیں مختلف بھی ہیں۔ ہم سائنسی طرز استدلال کو دینی استدلال پر قیاس نہیں کر سکتے۔ دنیا سے چوں کہ ہم سب متاثر ہوتے ہیں اس لیے فکر کی تشریح کے اس پہلو میں خیال رکھنا چاہئے کہ ایمان کے دلائل ہم جو بیان کریں وہ قرآن کی پیروی کرتے ہوئے بیان کریں۔ یہ چیلنج جو اس معاملہ میں سائنسی طرز استدلال کا ہے وہ نسبتاً چھوٹا چیلنج ہے۔

مسلمانوں کو اپنی تاریخ میں یونانی فلسفے سے جو چیلنج پیش آیا تھا وہ زیادہ بڑا چیلنج تھا، وہ اختلاف زیادہ ابھرا ہوا تھا۔ اس کا صحیح جواب وہی تھا جو بالآخر ہمارے اہل علم نے دریافت کیا۔ یعنی اس اجنبی طرز استدلال کو رد کیا جائے۔ صرف استدلال کو نہیں بلکہ طریقہ کو بھی رد کیا جائے اور اس کے بعد ہم قرآنی طریقے کو دریافت کریں اور اسی کو بیان کریں۔ بہر حال فکر کا ایک پہلو تو یہ ہے، جس میں ہم ایمانیات کے دلائل بیان کرتے ہیں۔ فکر کا جو دوسرا پہلو ہے وہ یہ ہے کہ ہم دین کے پورے نظام کو اور دین کی ساری تعلیمات کو بیان کرتے ہیں اور اس بیان کرنے کے سلسلے میں ان سوالات کا جواب دیتے ہیں جو دور نبویؐ میں پیش نہیں آئے تھے۔ اس لحاظ سے یہ پہلے پہلو سے مختلف بات ہے۔ ایمانیات میں تو اضافہ نہیں ہو رہا۔ ان کے سلسلے میں جو کچھ آپ بیان کریں گے وہ موجود ہے۔ لیکن جب دین کی تعلیمات کا انطباق کیا جائے گا تو حالات کے سیاق میں کیا جائے گا۔ حالات کے لحاظ سے نئے سوالات سامنے آئیں گے۔ یہ فکر اسلامی کا دوسرا پہلو ہے کہ دین کی تعلیمات کو بیان کرنا جیسی وہ ہیں اور جو نئے سوالات پیدا ہوئے ان کا جواب تلاش کرنا۔

انسانی علوم

تیسرا پہلو یہ ہے کہ دور نبویؐ کے فوراً بعد بھی اور موجودہ زمانے میں انسانوں نے مختلف علوم میں ترقی کی ہے۔ انسان مختلف موضوعات پر غور کرتا اور معلومات حاصل کرتا رہا۔ موجودہ دور میں یہ علوم موجود ہیں جو زیادہ تر اسلامی دنیا سے باہر پچھلے تین سو برسوں میں فروغ پائے۔ ان میں سائنس ہے، سماجی موضوعات ہیں، قانون پر کام کیا گیا ہے، نفسیات پر تحقیق کی گئی ہے ان سارے کاموں میں مسلمانوں کا حصہ بہت کم رہا ہے۔ اور اسی لحاظ سے ان سارے کاموں کے انداز پر اسلامی فکر کا اثر بہت کم رہا ہے۔ تو اسلامی فکر کا تیسرا پہلو ان علوم سے متعلق ہے جو انسانوں کی ضرورت ہیں۔ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے مجبور ہے کہ علم کے میدان میں ترقی کرے، علمی دریافتیں سامنے لائے اور علمی انداز میں سوچے۔ ہم کو بتانا ہے کہ ان سارے علوم میں اسلام کی فراہم کردہ بنیاد کیا ہے، قرآن میں اور حدیث میں اور سیرت میں وہ کیا بنیادی تصورات ملتے ہیں جو علوم کے فروغ کے لیے بنیادیں فراہم کرتے ہیں؟ یہ وہ بات ہے جو پہلے بھی اہم تھی۔ پہلے مسلمان خود علم کے میدان میں ترقی کر رہے تھے اور تحقیقی کاوشوں کی رہ نمائی کر رہے تھے تو اس سوال کا جواب واضح تھا اور زمانہ بھی نسبتاً سادہ تھا۔ مگر اب زمانہ

> اصلاً دینی فکر کی بنیاد انسانوں کی پیش کی ہوئی کوئی دلیل نہیں ہے۔ بلکہ اللہ کی نازل کردہ ہدایت ہے۔ دینی فکر میں اور فلسفیانہ اور نظریاتی فکر میں یہ جو بنیادی فرق ہے یہ ہمارے سامنے رہنا چاہئے۔ نظریاتی اور فلسفیانہ فکر وہ ہے جو کسی انسان نے پیش کی اور اس نے دلائل بھی خود ہی فراہم کیے۔ اس فکر کو صحیح ثابت کرنے کے لیے کچھ باتیں پیش کیں۔ لیکن دینی فکر کسی انسان کی ایجاد کردہ نہیں ہے بلکہ اللہ کی ہدایت پر مبنی ہے۔

پیچیدہ ہے اور مسلمانوں نے علمی رہ نمائی کا کام عرصے سے چھوڑ رکھا ہے، اس لیے اب اس کی ضرورت ہے کہ علوم کی اسلامی اساس فراہم کی جائے۔ یہ فکر اسلامی کے تین پہلو ہیں جس پر ہر نسل کو کام کرنے ضرورت ہے۔ ایمانیات کے دلائل، اسلام کی تعلیم اور اس کا انطباق اور علوم کے لیے اسلامی اساس۔

ہدایت ناشناس فکر

مولانا مودودیؒ نے بہت کچھ کہا اور لکھا۔ آپ جانتے ہیں کہ ان کا کارنامہ صرف ان کی تحریروں تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ وہ باعمل آدمی تھے۔ پریکٹکل آئیڈیلسٹ ان کو کہا گیا ہے۔ ایسا مثالیت پسند شخص جو انتہائی عملی بھی ہو۔ مولانا مودودی نے افکار پیش کیے، انھوں نے جو کچھ کیا ہمیں اس کو بھی سامنے رکھنا ہوگا۔ اس لحاظ سے جب ہم دیکھتے ہیں تو مولانا مودودیؒ کے افکار میں بعض باتیں ابھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ ان میں جو بات ہمارے سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ مولانا مودودیؒ نے موجودہ دور کی غالب فکر پر گرفت کی۔ اس کو ہدایت ناشناس فکر کہہ سکتے ہیں (وہ فکر جو ہدایت الٰہی سے بے نیاز ہے) مولانا مودودیؒ نے اس فکر کے غلبے کو دور کرنے کی کوشش کی۔ مولانا کے کام میں یہ بات بڑی ابھری ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ مولانا نے محسوس کیا کہ امت مسلمہ ایک یلغار اور طوفان کی زد میں ہے۔ وہ یلغار اور طوفان عملی بھی ہے اور علمی بھی۔ جس وقت مولانا نے اپنی دعوت کی ابتدا کی تھی تو متحدہ ہندوستان (ہمارا ملک) اس وقت غلام تھا اور عالم اسلام کا بہت بڑا حصہ انگلینڈ اور فرانس کا غلام تھا۔ یہ یلغار سیاسی اور فوجی یلغار بھی تھی جس کی زد میں امت مسلمہ تھی لیکن اس سے آگے بڑھ کر وہ فکری یلغار تھی، جس میں مسلمانوں کا اعتماد اور ایمان، اسلامی فکر پر متزلزل ہو رہا تھا۔

مولانا مودودیؒ کی تحریروں میں شروع سے آخر تک ہمیں یہ پہلو نمایاں محسوس ہوتا ہے کہ مولانا مودودیؒ نے امت مسلمہ کو دوبارہ دین پر قائم کرنے کی کوشش کی اور انحراف سے بچانے کی کوشش کی۔ مولانا مودودیؒ کے کام میں اس کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ انھوں نے امت مسلمہ کے تحفظ کی، دفاع کی اور اس کو حملوں سے بچانے کی کوشش کی۔

داخلی خطرات کا مقابلہ

مولانا مودودیؒ کے کام کو ہم دیکھتے ہیں تو ہمیں یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اس بڑے خطرے کا نوٹس لیا جو باہر سے آیا۔ یعنی سیاسی یلغار و فوجی یلغار کی شکل میں اور اسی طرح اجنبی فکر کے تسلط کی شکل میں۔ یہ اجنبی فکر دین کا اور خدا کا انکار کرتی تھی۔ خدا کی ہدایت کا انکار کرتی تھی۔ لیکن ایسا نہیں تھا کہ امت مسلمہ کو صرف یہی چیلینج پیش آئے، بلکہ امت کو وہ چیلنج بھی پیش آئے جو اس کے ذیل میں تھے۔ جو طریقہ مولانا مودودیؒ نے اختیار کیا بڑے خطرہ کے مقابلے میں، وہی طریقہ آپ نے اختیار کیا چھوٹے خطرات کے مقابلے میں بھی۔ مثال کے طور پر مسلمانوں میں حدیث کے انکار کا رجحان پیدا ہوا۔ ظاہر ہے کہ حدیث کے انکار کا کچھ نہ کچھ تعلق بالواسطہ اس مغربی فکر کے تسلط سے ہے۔ لیکن سارا رشتہ آپ مغربی فکر سے نہیں جوڑ سکتے۔ انکار حدیث مسلمانوں کی خود اپنی کم زوری ہے۔ جو تاریخ کے مختلف ادوار میں سامنے آتی رہی ہے۔ مولانا مودودیؒ نے اس کا بڑا مدلل جواب دیا ہے۔ اسی طرح مسلمانوں میں چھوٹے چھوٹے فتنے اٹھے۔ کسی شخص نے قربانی کا انکار کیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ قربانی کا حکم اسلام میں نہیں ہے۔ مولانا مودودیؒ نے اس کی مدلل تردید کی۔ کسی شخص نے ذبیحہ کے احکام کی غلط تاویل کرنے کوشش کی۔ مولانا مودودیؒ نے اس کی اصلاح کی۔ قادیانیت کا بہت بڑا مسئلہ ابھرا۔ پاکستان میں خاص طور پر اور عالم اسلام میں عام طور پر۔ یقیناً اس کا مقابلہ کرنے میں بہت سارے لوگوں کا حصہ ہے۔ لیکن مولانا مودودیؒ کا جو نمایاں کردار ہے اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بالآخر پاکستان میں قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا گیا، اس کے بعد پورے عالم اسلام میں متفقہ طور پر قادیانیوں کو غیر مسلم تسلیم کر لیا گیا۔ اس کام کے کرنے میں مولانا مودودیؒ کا اور جماعت اسلامی کا بڑا رول رہا ہے۔

مولانا مودودیؒ کے افکار میں یہ بات ہمیں محسوس ہوتی ہے کہ امت مسلمہ کے تحفظ اور دفاع پر آپ نے توجہ کی اور فکری یلغار اور انحرافات و گم راہیوں کا مقابلہ کیا۔ باہری اثرات کے علاوہ خود اندر کی کم زوریوں کی وجہ سے جو گم راہیاں سامنے آ رہی تھیں ان کا مقابلہ آپ نے کیا اور ہر اس چیز کا نوٹس لیا جو امت کو غلط راستے پر لے جا سکتی ہو۔

اسلامی تحریک کے نام سے جو تنظیمیں دنیا کے مختلف حصوں میں کام کر رہی ہیں ان کے سامنے اپنے کام ہیں، جو ان کے منصوبوں کا حصہ ہیں۔ ان میں متعین باتیں ہوتی ہیں۔ مثلاً جماعت اسلامی ہند کے منصوبے میں متعین باتیں ہیں۔ دعوت، اسلامی معاشرہ کی تعمیر، مسائل کا حل، خدمت خلق وغیرہ۔ اس طرح کے متعینہ کام منصوبے میں سامنے آتے ہیں۔ اسلامی مزاج کا تقاضہ یہ ہے کہ منصوبہ

کے ساتھ ساتھ امت کے مجموعی احوال پر بھی نظر رکھی جائے، اس کو انحراف، گم راہی، مغلوبیت و مرعوبیت سے بچایا جائے۔ ہر اعتبار سے، سیاسی، فکری اور ذہنی۔

انسانیت عامہ کا حال

جو لوگ مولانا کے افکار کے قدرداں ہیں ان کو بھی اپنے کاموں میں اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ امت مسلمہ کے احوال پر نگاہ رکھی جائے اور اسے درست خطوط پر قائم کیا اور قائم رکھا جائے۔ مولانا مودودیؒ کے افکار میں جو دوسری چیز ہمیں نمایاں نظر آتی ہے وہ یہ ادراک ہے کہ امت مسلمہ کے علاوہ آج کے دور کا انسان بھی ایک بڑی گم راہی کی زد میں ہے۔ وہ گم راہی ایسی ہے جس نے انسان کے سارے کاموں کو اور اس کی ساری انفرادی و اجتماعی زندگی کو متاثر کیا ہے۔ اس گمراہی کو ہم مختصر لفظوں میں ہدایت الٰہی سے بے نیازی کہہ سکتے ہیں۔ کچھ لوگ تو ایسے ہیں جو خدا کا انکار کرتے ہیں صاف لفظوں میں لیکن جو خدا کا انکار نہیں کرتے وہ بھی خدا کی ہدایت کا انکار کرتے ہیں یا کم از کم اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ خدا کی ہدایت سے وہ بے نیاز ہیں۔ یہ عصر حاضر کی گم راہی ہے۔

امت مسلمہ سے آگے بڑھ کر جب ہم دنیائے انسانیت پر نظر ڈالتے ہیں جیسا کہ مولانا مودودیؒ نے ڈالی تو ایک حساس انسان کی حیثیت سے انھوں نے محسوس کیا کہ موجودہ دور کی یہ بنیادی گم راہی ہے۔ جو ہدایت الٰہی سے بے نیازی کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ انھوں نے اس گم راہی کے مقابلے کے لئے اسلامی افکار پیش کئے۔ انحراف کے مقابلے میں انھوں نے اسلام کو پیش کیا۔ انھوں نے آغاز کیا ان باتوں سے جو موجودہ دور کا آدمی سمجھتا ہے یا کہتا ہے۔ دلائل کا نوٹس لیا، متعین فلسفوں اور نظریات پر تنقید کی۔ ان کی کم زوریاں واضح کیں اور ہدایت الٰہی کی اتباع کیوں کرنی چاہئے، اس ضرورت کو واضح کیا۔

تفہیم القرآن

مولانا مودودیؒ نے ایک گفتگو میں کہا تھا کہ جب میں نے اپنا علمی کام شروع کیا تو میں نے سوچا تھا کہ میں قرآن مجید کی تفسیر لکھوں گا، پھر احادیث کا مجموعہ ترتیب دوں گا۔ پھر سیرت پر کتاب پر لکھوں گا۔ لیکن تفسیر لکھنے میں ہی ایک لمبا وقت لگ گیا، تو میرے پاس اب باقی دو کاموں کا موقع نہیں ہے۔ یعنی تفسیر جو سن ۱۹۴۲ء سے لکھنا شروع کی تھی، ۱۹۷۲ء میں جا کر مکمل ہوئی۔ تیس سال کے عرصے میں۔ بہر حال مولانا مودودیؒ کے احباب نے آپ کی ہی تحریروں سے منتخب کر کے سیرت کی کتاب بھی مرتب کی اور احادیث کا مجموعہ بھی مرتب کر لیا۔

مولانا مودودیؒ کے افکار کو جتنی واضح اور مفصل شکل میں تفہیم القرآن میں پیش کیا گیا ہے، وہ دوسری کتابوں میں نہیں ہے۔ دوسری کتابیں تو کسی متعین موضوع پر ہیں، لیکن تفہیم القرآن کی مکمل چھ جلدیں ایسی ہیں جو مولانا مودودیؒ کے افکار کو بہت واضح اور آسان زبان میں پیش کرتی ہیں۔ ہمارے بہت سے احباب ایسے ہیں جنھوں نے مولانا مودودیؒ کی کچھ کتابوں کا مطالعہ کیا ہے اور اس کے نتیجہ میں ان کے افکار کے بارے میں ایک رائے قائم کی ہے۔ وہ رائے کچھ زیادہ صحیح نہیں ہوتی۔ اگر تفہیم القرآن کو سامنے رکھا جائے تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ مولانا مودودیؒ پوری بات کیا کہتے ہیں۔ جن کو اپنی مختصر کتابوں میں کہنے کا موقع شاید نہیں پا سکے۔ ظاہر ہے کہ انسان تو انسانی زبان میں کلام کرتا ہے۔ یہ تو صرف خدا کی زبان ہے جو مکمل ہوتی ہے۔ جس کی ایک آیت بھی آپ پڑھیں تو ہدایت دیتی ہے۔ لیکن انسانی کلام کا معاملہ یہ نہیں ہے۔ جو افکار مولانا مودودیؒ کے تفہیم میں ہمارے سامنے آتے ہیں بڑی مکمل شکل میں آتے ہیں۔

آپ مولانا مودودیؒ کے پیش کردہ پروگرام میں یہ محسوس کریں گے کہ ان دو باتوں کو سامنے رکھا گیا۔ یعنی امت مسلمہ کا تحفظ وسیع معنوں میں اور عالم انسانیت کو گم راہی سے نکالنا۔ ان دو کاموں کی اہمیت کا احساس مولانا مودودیؒ کو شدت سے تھا۔ ظاہر ہے کہ قریب ترین ماحول کے مسائل سے آپ نے زیادہ تعرض کیا۔ ہندوستان کے ماحول میں تحریک یعنی جماعت اسلامی کی ابتدا کی گئی۔ مولانا مودودیؒ نے جو باتیں جماعت اسلامی کی تشکیل کے بعد کہیں اس میں یہ بات شامل تھی کہ دعوت کے لیے جو کچھ کرنا ہے علمی اور عملی سطح پر وہ ایک شخص کے بس کا کام نہیں ہے۔ اس لیے جماعت کی ضرورت ہے اور اس جماعت میں جو لوگ باضابطہ شامل نہ ہوں ان سے بھی توقع کی جاتی ہے کہ وہ اس کام میں تعاون کریں گے۔

اجتماعی پیش رفت کی ضرورت

مولانا مودودیؒ نے ایسے اہل علم اصحاب کی ضرورت محسوس کی، جو علمی اور تحقیقی اور فکری کام کو آگے بڑھائیں۔ اس کام میں حصہ لیں۔ اللہ کے فضل سے بر صغیر میں ایسے لوگوں کی خاصی تعداد ہے۔ جماعت اسلامی پاکستان، جماعت اسلامی ہند کے وابستگان ان سے متاثر ہونے والے یا کم از کم ان کے فکر سے متاثر ہونے والے اہل علم کی ایک بڑی تعداد ہے جو مولانا مودودیؒ کی زندگی ہی میں سامنے آ گئے تھے اور جنھوں نے علمی تحقیقی اور فکری میدان میں بہت سارے کام کیے۔ لیکن دو باتیں واضح ہیں۔ ایک یہ کہ ان کاموں کا معیار مولانا مودودیؒ کے معیار سے کم ہے۔ دوسرا یہ کہ سارے کام ملا کر بھی ہماری ضرورت سے کم ہیں۔ وہ ضرورت جو انسانیت کی رہ نمائی کی اور امت مسلمہ کے حال کو درست کرنے کی ہے۔

مولانا مودودیؒ نے یہ بات محسوس کی تھی کہ یہ اجتماعی کام ہے۔ یہ کام ٹیم ورک چاہتا ہے۔ یہ بات تاریخ کے ہر دور میں صحیح تھی۔ پہلے امت میں علمی مزاج عام تھا، علم و تحقیق کا رواج تھا اور ہماری جو ضرورتیں علم اور فکر سے پوری ہوتی ہیں، وہ ضرورتیں پوری ہو رہی تھیں، لیکن آج دور زوال ہے، اس میں ہر کام کی طرح علمی کام بھی متاثر ہو چکا ہے۔ وہ لوگ جو محقق اور اہل فکر ہیں ان کی تعداد امت میں خاصی کم ہے۔

مولانا مودودیؒ کا منشا یہ نہیں تھا کہ لوگ بس ان کی کتابیں پڑھیں اور جو کچھ انھوں نے کہا اس کو جوں کا توں مانتے چلے جائیں اور خود کچھ نہ کریں، خود علم اور فکر اور تحقیق کے دائرے میں کوئی قدم آگے نہ بڑھائیں۔ یہ ان کا منشا نہیں تھا۔ انھوں نے بہت واضح لفظوں میں اس کی ضرورت محسوس کی تھی کہ پورا قافلہ منظم ہو جو فکری، علمی اور تحقیقی کام کو آگے بڑھائے۔ خود مولانا مودودیؒ نے جو کچھ کہا اس کو سمجھے، اس کو زیادہ بہتر طریقے سے بیان کرے، اس کی کم زوریوں کو دور کرے

اور امت اور انسانیت کی جو بھی ضرورتیں ہیں ان کو پورا کرے۔

غلط فہمیوں کا ازالہ

اب مجھے مختصر طور پر وہ بات آپ کے سامنے رکھنی ہے جو مولانا مودودیؒ کے منفی تعارف کے سلسلے میں ہے۔ یہ بات ہم جانتے ہیں کہ مولانا مودودیؒ کا تعارف ابتدا میں جس کتاب کے ذریعہ سے ہوا، وہ 'الجہاد فی الاسلام' تھی۔ الجہاد فی الاسلام میں مولانا مودودیؒ نے جہاد کی ضرورت، اس کی حکمت اور اسلام کی مجموعی تعلیم میں جہاد کے مقام کو واضح کیا۔ جتنی ضرورت اس زمانے تھی، واضح کرنے کی اس سے زیادہ ضرورت آج ہے۔ مولانا مودودی نے صاف طور پر یہ بات بیان کی کہ ایک قسم تو جہاد کی وہ ہے جسے ہم دفاع کہتے ہیں۔ یہ مدافعانہ جہاد ہے، سب لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ دفاع کے لیے جہاد ضروری ہے۔ مناسب اور جائز ہے۔ جہاد کی دوسری قسم وہ ہے جو دنیا کو درست کرنے کے لیے ہے اور یہ جہاد حدود اور آداب اور شرائط کے ساتھ ہوگا۔ اس کی غرض یہ ہے کہ اللہ کے دین کے راستے کی رکاوٹیں دور ہو جائیں۔ دین کی دعوت کے راستے میں، دین پر عمل کے راستے میں حائل رکاوٹیں دور ہوں۔ رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے مصلحانہ جہاد کرنا، یہ بھی جہاد کا حصہ ہے۔

آج کی دنیا دوسری بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہے اور دنیا کے اس رویے کا اثر خود بعض مسلمانوں پر پڑا ہے۔ وہ قرآن حدیث کی ساری تصریحات کے علی الرغم اور ہماری تاریخ کے نمایاں اہل علم کے اقوال کے خلاف، جہاد کی غلط تعبیریں کرنے میں مصروف ہیں۔ مولانا مودودیؒ کے افکار میں بڑی اہم بات یہ ہے کہ آپ نے جہاد کی مکمل اور صحیح تشریح بیان کی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ہم اسلام پر ایمان لائے ہیں تو معقول طریقہ یہ ہے کہ اسلام کی جو تعلیمات ہیں، جیسی ہیں ویسی مان لیں۔ جو استدلال اسلام کرتا ہے، اسی استدلال کو پیش کریں۔ اسلام پر ایمان لانے کے بعد، اس کی تعلیمات کو مسخ کرنے کی کوشش کرنا، یہ کسی معقول آدمی کا کام نہیں ہوسکتا۔ مولانا مودودیؒ نے بتایا کہ اس میں کوئی شبہہ نہیں ہے کہ جہاد معقول ہے۔ جہاد کی ضرورت ہے۔ دنیا کی کوئی قوم اور کوئی نظریہ ایسا نہیں ہے جو جنگ کی ضرورت کا انکار کرتا ہو۔ (ہر قسم کے حالات میں) اسلام نے اس سلسلے میں جو تعلیم دی ہے اس سے زیادہ معتدل، اس سے زیادہ معقول، اس سے بہتر تعلیم کوئی نہیں پائی جاسکتی۔ مولانا مودودیؒ نے اس سلسلے میں جو کام کیا، اس کام کا تعارف از سرِ نو ضرور ہونا چاہیے۔

اس کانفرنس کا جو اصل پیغام ہے وہ یہ ہے کہ اس علمی و تحقیقی تحریک کو آگے بڑھایا جائے، جس کی ابتدا مولانا مودودیؒ نے کی۔ وہ توقع رکھتے تھے اپنے احباب سے کہ وہ اسے آگے بڑھائیں گے۔ ہم سب کو اس توقع پر پورا اترنا چاہیے۔

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

غزل

زندگی تجھ سے نبھانے کا سلیقہ آ گیا
آنکھ سے کاجل چرانے کا سلیقہ آ گیا

ایک دن اس نے کہا یہ مجھ سے شرماتے ہوئے
آپ کو خوابوں میں آنے کا سلیقہ آ گیا

آپ پتھر دے رہے ہیں دیجئے سوغات میں
ہم کو آئینہ بنانے کا سلیقہ آ گیا

دیکھئے آنکھوں میں آنسو کا کوئی قطرہ نہیں
ہم کو آخر مسکرانے کا سلیقہ آ گیا

اب دھواں اٹھتا ہے نہ شعلے ہیں نہ چنگاریاں
دل محبت میں جلانے کا سلیقہ آ گیا

تم ہمارے حوصلوں کو کیا کہوگے اب ہمیں
موت سے آنکھیں لڑانے کا سلیقہ آ گیا

اب مرے بچے نہیں ڈرتے کسی طوفان سے
ناؤ کاغذ کی چلانے کا سلیقہ آ گیا

تجربوں کی آنچ میں خود کو تپایا ہے جمیلؔ
تب کہیں مجھ کو زمانے کا سلیقہ آ گیا

جمیل نظام آبادی

خطبۂ صدارت

ایس آئی او آف انڈیا کی فروری 2018 میں منعقدہ کُل ہند کانفرنس میں نوجوانوں سے امیر جماعت سید جلال الدین عمری صاحب کا پُرسوز خطاب۔

الحمد للہ رب العلمین۔ والصلوۃ و السلام علی سید المرسلین و علی آلہ و اصحابہ اجمعین۔ اما بعد!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

عزیزو اور نوجوانو!

جب کبھی آپ نوجوانوں سے ملاقات کا موقع ملتا ہے، ایس آئی او کے ممبران سے ملاقات کا ملتا ہے، توصحیح بات یہ ہے کہ اسی طرح کی خوشی ہوتی ہے جیسے کسی بوڑھے باپ کو اپنی اولاد کو دیکھ کر ہوتی ہے۔ یہ محسوس ہوتا ہے جیسے جسم میں تازہ خون دوڑنے لگا ہو۔

میرے عزیزو اور دوستو!

اگر میں پیارے بچو کہوں، تو بھی غلط نہیں ہوگا۔ لوگ کہتے ہیں، سوال کرتے ہیں کہ اس ملک کا مستقبل کیا ہوگا؟ میں کہتا ہوں: اس ملک کا مستقبل میرے یہ نوجوان ہیں۔ لوگ کشمکش میں مبتلا ہیں کہ اس ملک کے مستقبل کا کیا ہوگا۔ اور انھوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس ملک کا مستقبل تابناک ہوگا۔ اس کے تابناک مستقبل کو کوئی روک نہیں سکتا۔ ہزاروں کا یہ مجمع اور جہاں میں جاتا ہوں ایسا ہی مجمع ملتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں تنہا نہیں ہوں، جماعت اسلامی میرے ساتھ ہے اور یہ ہزاروں لاکھوں نوجوان میرے ساتھ ہیں۔ یقیناً آپ میرے ہیں اور میں آپ کا ہوں۔ آپ میرے ساتھ ہیں اور میں آپ کے ساتھ رہوں گا، جب تک زندگی ہے۔

(۱) میرے دوستو اور ساتھیو!

یہاں اس بات کا بار بار ذکر آتا ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کی جان، مال، عزت اور آبرو محفوظ نہیں ہے اور جو واقعات ہو رہے ہیں اس سے اس بات کی تائید بھی ہو جاتی ہے۔ دستور نے جو بنیادی حقوق فراہم کیے ہیں وہ پامال ہو رہے ہیں اور حکومت اپنی ذمہ داری سے غافل ہے۔ اگر حقیقت میں دیکھا جائے تو مسلمانوں کی جان، مال، عزت اور آبرو کی حفاظت آپ کی ذمہ داری ہے۔ کوئی حکومت آپ کی حفاظت کرنے والی نہیں ہے۔ آپ کو عزت اور وقار کے ساتھ اس دنیا میں رہنا ہے، ذلت کی زندگی گوارا نہیں کرنی ہے۔

عہد نبویؐ کا ایک واقعہ ہے، جس کی نشان دہی قرآن میں کی گئی ہے:

يَقُولُونَ لَئِن رَّجَعْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ (المنافقون: ۸)

''یہ کہتے ہیں کہ ہم مدینہ واپس پہنچ جائیں تو جو عزت والا ہے وہ ذلیل کو وہاں سے نکال باہر کرے گا''۔

یہ بے ایمان لوگ کہتے ہیں کہ مدینہ واپس ہونے کے بعد ہم میں جو عزیز ہے، جو طاقت ور ہے، وہ ان ذلیلوں کو نکال دے گا۔ قرآن نے کہا کہ ان سے کہہ دو کہ عزت اللہ کے لیے ہے:

وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَلَٰكِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَا يَعْلَمُونَ (المنافقون: ۸)

''حالاں کہ عزت تو اللہ اور اس کے رسولؐ اور مومنین کے لیے ہے، مگر یہ منافق جانتے نہیں ہیں''۔

جو لوگ کہہ رہیں کہ عزت اور ذلت ہمارے ہاتھ میں ہے، ان سے قرآن کہتا ہے کہ عزت تو اللہ، اس کے رسول اور اہل ایمان کے لیے ہے۔ وہ عزت کے ساتھ ہیں اور عزت کے ساتھ رہیں گے۔ کوئی ان کی Dignity کو چیلنج نہیں کر سکتا۔ ہجرت کے موقع پر دشمنوں نے کہا کہ ہم محمدؐ کو مکہ سے نکال دیں گے یا ختم کر دیں گے۔ قرآن نے کہا کہ بتا دو ان کو کہ:

وَإِذًا لَّا يَلْبَثُونَ خِلَافَكَ إِلَّا قَلِيلًا (الاسراء: ۷۶)

''اگر یہ ایسا کریں گے تو تمھارے بعد خود یہاں کچھ زیادہ دیر نہ ٹھہر سکیں گے''۔

محمدؐ اور ان کے ساتھی تو کون و مکاں ہیں، ان کی وجہ سے اللہ کی رحمتیں نازل ہو رہی ہیں۔ ان کی وجہ سے تمہاری زندگی ہے۔ وہ اگر چلے گئے یہاں تو تم بھی نہیں رہ سکو گے۔ یہ ملک آپ کی وجہ سے۔ آپ کے بغیر اس ملک کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ اس اندھیرے میں

آپ روشنی کا مینار ہیں۔ آپ سے دنیا روشنی حاصل کرے گی۔

(۲) میرے دوستو اور ساتھیو!

آپ کو اس ملک میں مذہبی آزادی حاصل ہے، دستور کے لحاظ سے آپ اپنے مذہب پر عمل کر سکتے ہیں۔ اسے باقی رہنا چاہیے۔ اسے ختم نہ ہونے دیجیے، اسے ختم کرنے کی کوشش کی جائے تو اس کوشش کو کامیاب نہ ہونے دیجیے۔ یہ قرآن نے آپ کو حق دیا ہے کہ آپ اپنے مذہب پر عمل کر سکتے ہیں۔ ہر شخص عمل کر سکتا ہے۔ قرآن نے کہا سب کو آزادی ہے۔

لاَ إِکْرَاهَ فِیْ الدِّیْنِ (البقرۃ:۲۵۶) 'دین میں کوئی جبر نہیں ہے'۔

مذہبی آزادی کا تصور تو قرآن نے دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَقُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّکُمْ فَمَن شَاءَ فَلْیُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْیَکْفُرْ (الکھف:۲۹)

''اور اے نبی کہہ دیجیے! جس کا جی چاہے مان لے اور جس کا جی چاہے انکار کر دے''۔

جس کا جی چاہے ایمان لائے، جس کا جی چاہے نکار کرے۔ اور حکومت اور اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں آیا مدینہ میں تو یہ اعلان کیا کہ:

لاَ إِکْرَاهَ فِیْ الدِّیْنِ (البقرۃ:۲۵۶) 'دین میں کوئی جبر نہیں ہے'۔

یہ ہے اسلامی ریاست۔ یہ ہے اصلاً اسلامی ریاست۔ اس میں انسان کو آزادی حاصل ہوگی اور اس اعلان کے ساتھ کام کرے گی کہ کسی کے ساتھ جبر نہیں ہوگا۔

قَد تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ فَمَنْ یَکْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَیُؤْمِن بِاللّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَیَ لاَ انفِصَامَ لَهَا وَاللّهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ (البقرۃ: ۲۵۶) ''صحیح بات، غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے''۔

ہدایت کیا ہے، ضلالت کیا ہے، سب واضح ہو چکا ہے۔ جو شیطان کے راستے کو چھوڑ دے اور اللہ کے راستے پر چلے تو اسے مضبوط بنیاد مل جائے گی۔

میرے دوستو اور ساتھیو! یہ اسلام کی حفاظت ہے اور دستور نے بھی آپ کو اجازت دی ہے۔ دستور ثانوی چیز ہے۔ اسلام آپ کا فطری حق ہے، یہ آپ کو خدا نے دیا ہے۔ خدا کے رسولؐ نے دیا ہے۔ تو اسے باقی رہنا چاہیے۔

(۳) دوستو اور ساتھیو!

اب میں آپ سے کچھ باتیں کہوں گا۔ آپ سے نہ کہوں تو کس سے کہوں گا۔ آپ کو یہ آزادی حاصل ہے، کیا آپ اس پر عمل کر رہے ہیں؟___ آپ مقابلہ کیجیے۔ کسی کو اپنے حق پر حملہ آور ہونے کی اجازت نہ دیجیے۔ قرآن کا حوالہ دیجیے، فطرت کا حوالہ دیجیے، دستور کا حوالہ دیجیے، سب بجا ہے___ لیکن مجھے یہ پوچھنا چاہیے۔ میں اپنے بچوں سے نہیں پوچھوں گا تو کس سے پوچھوں گا کہ کیا تم اس کے مطابق عمل کر رہے ہو؟ قرآن نے کہا تمھیں نماز کا پابند ہونا چاہیے۔ اللہ کے نیک بندے وہ ہوتے ہیں جو نماز کے پابند ہوتے ہیں اور ان کا ظاہر اور باطن اللہ کے سامنے جھک جاتا ہے۔ ان کے بارے میں کہا کہ وہ زکوٰۃ، حج پر عمل کرتے ہیں اور راست باز اور باعفت ہوتے ہیں۔ با اخلاق ہوتے ہیں۔ ان کے کردار پر حملہ نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ۔ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ۔ وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ۔ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّکَاةِ فَاعِلُونَ۔ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ (المومنون:۱۔۴)

''یقیناً فلاح پائی ہے ایمان لانے والوں نے، جو اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرتے ہیں، لغویات سے دور رہتے ہیں، زکوٰۃ کے طریقے پر عامل ہوتے ہیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں''۔

اس میں مومنین کی یہ صفت بتائی گئی ہے کہ وہ اپنی عفت اور عصمت کی حفاظت کرتے ہیں اس طرح جس طرح کسی قیمتی چیز کی حفاظت کی جاتی ہے۔ دولت اور سرمایہ سمجھتے ہیں وہ عفت اور عصمت کو۔ قربان جایئے ان نوجوانوں پر جو اس صفت سے متصف ہیں۔ میں بھی قربان ہو جاؤں اور آپ بھی قربان ہو جائیں کہ کسی نوجوان کے بارے میں کہا جائے کہ فلاں مومن کے اندر یہ صفت موجود ہے۔

میرے دوستو اور ساتھیو! ایسا کردار پیدا کیجیے کہ کوئی انگلی نہ اٹھا سکے۔ قرآن نے کہا کہ اللہ کے نیک بندے وہ ہیں جو بوڑھے ماں باپ ان کے پاس رہیں تو اف تک نہ کہیں۔ یہ نہیں کہ شادی کے بعد ان کا رویہ بدل گیا ہو۔ قرآن نے کہا خدمت کرو ان کی، انھیں اف تک نہ کہو اور شرافت کے ساتھ بات چیت کرو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَقَضَی رَبُّکَ أَلاَّ تَعْبُدُواْ إِلاَّ إِیَّاهُ وَبِالْوَالِدَیْنِ إِحْسَاناً إِمَّا یَبْلُغَنَّ عِندَکَ الْکِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ کِلاَهُمَا فَلاَ تَقُل لَّهُمَا أُفٍّ وَلاَ تَنْهَرْهُمَا وَقُل لَّهُمَا قَوْلاً کَرِیْماً۔ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُل رَّبِّ ارْحَمْهُمَا کَمَا رَبَّیَانِیْ صَغِیْراً (بنی اسرائیل:۲۳۔۲۴)

''تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو، مگر صرف اس کی۔ والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو، اگر تمہارے پاس ان میں سے کوئی ایک، یا دونوں، بوڑھے ہو کر رہیں تو انھیں اف تک نہ کہو، نہ انھیں جھڑک کر جواب دو، بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو اور نرمی اور رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو اور دعا کرو کہ پروردگار، ان پر رحم فرما، جس طرح انھوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا''۔

اللہ نے مومنوں کو یہ حکم دیا ہے کہ والدین کے سامنے جھک کر رہو۔ اپنی پرواز ان کے سامنے نہ دکھاؤ کہ ہم بھی اتنے بلند ہیں۔

ہمیں غور کرنا چاہیے کہ کیا واقعی ہمارا رویہ ماں باپ کے ساتھ ایسا ہی ہے جیسا کہ ہمیں حکم دیا گیا ہے۔ سب سے پہلے تو مجھے جائزہ لینا چاہیے۔ میرے ماں باپ نہیں رہے، لیکن جب تھے تو میں نے ان کے ساتھ کیسا سلوک کیا اور آپ میں سے بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کے والدین حیات ہیں، خدا ان کی عمر دراز کرے، سلامت رکھے، یہ رویہ ان کے ساتھ ہونا چاہیے۔ جب قرآن نے یہ کہا تو اس وقت کسی نے آ کر نبیؐ سے یہ نہیں کہا کہ ہمارا یہ بچہ ہمارے ساتھ یہ زیادتی کر رہا ہے۔ کہیں کوئی کیس درج نہیں ہوا۔ ایک بھی واقعہ نہیں ہے۔

دوستو اور ساتھیو! پرسنل لا شریعت کا بڑا حصہ ہے۔ اس کے لیے آپ مقابلہ بھی کرتے ہیں، حکومت سے مطالبہ بھی کرتے ہیں اور دستور نے بھی آپ کو

حق دیا ہے کہ آپ پرسنل لا پر عمل کر سکتے ہیں۔قرآن نے کہا کہ لازماً اس کی پابندی کرو ورنہ تباہ ہو جاؤ گے۔اب جب کہ حکومت آپ کے پرسنل لا کو ختم کرنا چاہتی ہے؛طرح طرح کے بہانے ہو رہے ہیں،ایک سوال یہ بھی ہے کہ جس پرسنل لا کے لیے آپ جان دے رہے، کیا اس پر عمل بھی کر رہے ہیں؟ کیا آپ کا اپنے گھر میں، اپنی بیوی کے ساتھ وہ سلوک ہے جس کی قرآن نے تعلیم دی ہے۔

قرآن میں کہا گیا:

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوف (النساء:۱۹)

''ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو''۔

دنیا میں یہ بہترین طریقہ ہے۔ اس کے مطابق آپ کا رویہ ہونا چاہیے۔کیا ایسا ہی رویہ ہے ہمارا، اس پر ہمیں غور کرنا چاہیے اور جائزہ لینا چاہیے۔ نبیؐ فرماتے ہیں کہ بیوی کو وہ کھلاؤ جو تم کھاتے ہو، وہ پہناؤ جو تم پہنتے ہو۔مطلب یہ ہے کہ تمھارا معیار زندگی اور اس کا معیار زندگی ایک ہونا چاہیے۔تم نے اسے ملازمہ سمجھ لیا، یہ نہیں ہونا چاہیے۔تو کیا واقعی ہمارے گھروں کی عورتوں کے ساتھ ہمارا ایسا ہی سلوک ہے۔نبیؐ فرماتے ہیں:

خیر کم خیر کم لاهله، وانا خیر کم لاهله (حدیث)

تم میں سے بہتر انسان وہ ہے جو اپنے بیوی بچوں کے حق میں بہتر ہو۔میں اپنے گھر والوں کے ساتھ بہتر سلوک کرتا ہوں۔

دنیا کے حق میں بہتر ہونا آسان ہے اور بیوی بچوں کے حق میں بہتر ہونا مشکل ہے۔توجس پرسنل لا کے لیے آپ جان دے رہے ہیں، میری گزارش یہ ہے کہ آپ اس کے مطابق عمل کریں۔آپ کہیں گے ابھی ہماری شادی نہیں ہوئی۔ شادی ہوگی اور یہ سب مراحل بھی آئیں گے۔لیکن مسئلہ یہ ہے کہ آپ کو ایسی فضا اس ملک کے اندر پیدا کرنی ہوگی اور انھیں بتانا ہوگا۔لوگ کہتے ہیں کہ تین طلاق دے دی جاتی ہے۔تین طلاق کا مسئلہ چھوڑیے۔ وہ نہ تو عورت کے حق میں ہے نہ کسی دوسرے کے حق میں ہے۔بلکہ اس کے ساتھ ظلم و زیادتی اور ناانصافی ہے۔ایسے کسی قانون کو کیسے قبول کیا جا سکتا ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قانون پارلیمنٹ میں پیش کر کے منظور کرانے والوں نے سوچا نہیں کہ یہ آپ کے خلاف ہے۔آپ کی مرضی کے خلاف ہے۔اب رہا یہ سوال کہ کیا ہوگا؟ یہ تو نہیں معلوم۔ہو سکتا ہے کہ حکومت اس سے جان چھڑانے کے لیے کوئی تدبیر نکال لے۔میرے دستو اور ساتھیو۔آپ دنیا کو بتائیے کہ پرسنل لا پر ہم لازماً عمل کریں گے اور ہر حال میں کریں گے اور ہر اس حکم پر عمل کریں گے، جس کی تعلیم قرآن نے دی ہے۔

(۴) میرے دوستو اور ساتھیو!

آخری بات مجھے یہ کہنی ہے کہ اسلام پر جو حملے ہو رہے ہیں، جن کی بہت سی مثالیں اس وقت دی گئی ہیں۔یہ حملے جاری رہیں گے۔ان کا مقابلہ کیجیے۔ لیکن آپ کی ذمہ داری یہ ہے کہ آپ دنیا کو بتائیے کہ اسلام امن و امان کا دین ہے، دین رحمت ہے، تمہارے لیے بھی اور ہمارے لیے بھی اور ساری دنیا کے لیے بھی۔یہ کام آپ جیسے طلبہ ہی کر سکتے ہیں۔دنیا کو بتائیے کہ جس اسلام کو بدنام کر رہے ہو جس کی تصویر بگاڑ رہے ہو، وہ اسلام وہ نہیں ہے۔بلکہ اسلام وہ ہے، جو دنیا کو امن و امان کا پیغام دیتا ہے:

وَاللّٰہُ یَدْعُوا إِلَی دَارِ السَّلاَمِ وَیَهْدِیْ مَن یَشَاءُ إِلَی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (یونس:۲۵)

''اور اللہ تمھیں دار السلام کی طرف دعوت دے رہا ہے، (ہدایت اس کے اختیار میں ہے) جس کو چاہتا ہے وہ سیدھا راستہ دکھا دیتا ہے''۔

اللہ تو دار السلام کی طرف تمھیں بلا رہا ہے، جنت کی طرف بلا رہا ہے، جہنم سے نکالنا چاہتا ہے۔یہ کام آپ کے کرنے کا ہے۔آپ کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔آپ طالب علم ہیں۔آپ سے ہی یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ اسلام پر جو حملے ہو رہے ہیں اور جس طرح اس کی تصویر بگاڑی جا رہی ہے، اس تصویر کو ٹھیک کریں۔اس لیے کہ آپ اس وقت کالجوں، یونی ورسٹیوں، درس گاہوں میں ہیں۔آپ کو موقع ہے، ان اعتراضات کو سمجھیے اور ان کا جواب دیجیے۔

آخری بات یہ ہے کہ اللہ کا دین پھیلنے کے لیے آیا ہے اور اس کا پھیلانا آپ کی ذمہ داری ہے۔یہ دین بڑی مشکلوں سے مختلف مراحل طے کرتا ہوا ہم تک پہنچا ہے اور اس کے بعد دوسروں تک پہنچانا آپ کی ذمہ داری ہے۔ نبیؐ نے حجۃ الوداع پر جب کہ ایک لاکھ سے زیادہ مسلمان آپ کے سامنے تھے، آپ نے خطبہ دیا، اس خطبہ میں انسانی حقوق کا تذکرہ کیا۔اس کے بعد فرمایا:

فلیبلغ الشاهد الغائب (حدیث) ''جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ ان لوگوں تک اللہ کا دین پہنچا دیں، جو یہاں موجود نہیں ہیں''۔

اس طرح یہ دین ہم تک پہنچا۔حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ یہ امت کو آپؐ کی آخری وصیت تھی۔اس وصیت پر آپ کو عمل کرنا ہے۔یہ دین سب کے لیے ہے، سارے انسانوں کے لیے ہے۔ یہ **هدی للناس** ہے۔ ہدایت ہے۔ساری انسانوں کو راستہ دکھانا آپ کا کام ہے۔

میرے دوستو اور ساتھیو! آپ اس کے لیے کمر بستہ ہو جائیے۔ دیکھیے دنیا کا نقشہ بدلتا ہے، آپ بدلیں گے یقیناً دنیا بدل جائے گی۔مگر اس کے لیے آپ کو غیر معمولی قربانی دینی ہوگی۔

بہر حال میں آپ کا شکر گزار ہوں۔میں آپ کا کیا شکر ادا کروں۔ شکر تو اللہ کے لیے ہے۔کیا کبھی باپ بھی اپنے بیٹوں کا شکریہ ادا کرتا ہے۔خوشی اس بات کی ہے کہ اتنی رات گزرنے کے باوجود آپ بیٹھے رہے، پوری باتیں سنی۔اللہ تعالی سے دعا ہے کہ جو باتیں عرض کی گئی ہیں وہ آپ کے ذہنوں میں محفوظ رہیں اور مجھے یہ اطلاع ملتی رہے کہ اس پر عمل ہو رہا ہے۔امید ہے کہ آپ مجھے یہ سننے کا موقع فراہم کریں گے۔انھیں باتوں کے ساتھ میں اپنی گفتگو ختم کرتا ہوں اور آپ کے حق میں دعا کرتا ہوں کہ جن جذبات کے ساتھ آپ یہاں آئے ہیں، وہ جذبات باقی رہیں اور فروغ پائیں اور دنیا کو ایک نئے نظام کی طرف آپ بلا سکیں۔

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

میں لازمی حاضری: ایک نیا سنگھی حملہ

اَبھے کمار

لازمی حاضری کا معاملہ جے این یو میں طول پکڑتے جا رہا ہے اور جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا ہے ویسے ویسے طلبا اور اساتذہ کا یقین مضبوط ہوتا جا رہا ہے کہ لازمی حاضری کے پیچھے سنگھ کی ایک گہری سازش ہے۔ بھگوا طاقتوں اور سرمایہ داروں کی آنکھوں میں جے این یو بہت دنوں سے کھٹک رہا تھا کیوں کہ یہاں سماج کے حاشیے پر رہنے والے لوگ بھی پڑھنے کے بارے میں سوچ سکتے ہیں۔ یہاں ان کے لیے ریزرویشن اور پسماندگی کی بنیاد پر Deprivation points بھی ملتے ہیں جن کی وجہ سے ان کو یہاں داخلہ لینے میں سہولت مل جاتی ہے۔ اسی کے ساتھ جے این یو کی فیس دوسری یونیورسیٹیوں بالخصوص پرائیویٹ یونیورسٹی کے مقابلے بہت کم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جے این یو کے طلبا میں گاؤں دیہات اور غریب خاندان سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی اکثریت ہوتی ہے۔ یہاں کے سیکولر ماحول میں پڑھنے کی وجہ سے طلبا کے اندر جمہوری اور روشن خیال نظریہ پرورش پاتا ہے اور طلبا کا عقیدہ مساوات، حریت اور اخوت جیسی اقدار پر مضبوط ہوتا ہے۔ جے این یو کی یہ خصوصیات سنگھ کو کسی طرح بھی قبول نہیں کیوں کہ سنگھ کا نظریہ ہمیشہ سے غیر مساوی نظام پر مبنی رہا ہے۔ اسی طرح سرمایہ داروں کو بھی جے این یو پسند نہیں ہے کیوں کہ یہاں کا ماڈل سوشلزم کی تائید کرتا ہے اور مساوات پر مبنی سماج کی تشکیل کا خواب دیکھتا ہے۔ مختصراً تعلیم کو بیچنے اور محروم طبقات جیسے دلت، آدی واسی، پچھڑا، مسلمان اور دیگر اقلیتی جماعت کو یونیورسیٹی سے بھگانے کی سمت میں جے این یو انتظامیہ لازمی حاضری کو ایک بڑے ہتھکنڈے کے طور پر استعمال کر رہا ہے جسے حکومت، سرمایہ دارانہ طبقہ اور سنگھ پریوار کی پشت پناہی حاصل ہے۔ بہت سے لوگوں کے بیچ میں یہ غلط فہمی ہے کہ جے این یو کے طلبا لازمی حاضری کی غیر ضروری مخالفت کر رہے ہیں۔ کارپوریٹ میڈیا لوگوں تک پوری حقیقت نہیں پہونچا رہا ہے۔ جے این یو کے طلبا لازمی حاضری کی مخالفت اس لیے کر رہے ہیں کیوں کہ اس کا تعلق تعلیم اور تحقیق کے فروغ سے نہیں ہے۔ اس طرح کی کاروائی محض طلبا اور اساتذہ پر نگرانی رکھنے کے لیے کی جا رہی ہے اور یہ ان کی آزادی کو ختم کرنے کی ایک کوشش ہے۔ لازمی حاضری آنے سے پہلے جے این یو میں اساتذہ، طلبا کی حاضری دوسری طرح سے لیتے تھے۔ طلبا کو اپنے اسائنمنٹ، ٹرم پیپر، وقفے وقفے پر دینے پڑتے تھے۔ سمسٹر کے دوران انھیں کئی بار امتحان بھی دینا پڑتا تھا جو طالب علم ان ساری تعلیمی ضروریات کو پورا نہیں کرتا ان کے خلاف تادیبی کاروائی بھی کی جاتی۔ مثال کے طور پر ان کو کم مارکس دیئے جاتے۔ کئی دفعہ وہ امتحان میں بھی فیل کر دیئے جاتے اور اس کے بعد بھی بات نہیں بنتی نظر آتی تو انھیں یونیورسیٹی سے باہر کر دیا جاتا۔ جب اس طرح کا منظم نظام طلبا کا درسی جائزہ لینے میں پہلے سے کامیاب تھا اور غیر حاضری اور ڈراپ آوٹ کا مسئلہ یہاں کبھی نہیں تھا تو پھر جے این یو وی سی لازمی حاضری کو تھوپ کر کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ آپ کو بھی معلوم ہے کہ جے این یو کہ رینکنگ ہندستان کی ٹاپ یونیورسیٹیوں میں ہوتا ہے اور یہ سب بغیر لازمی حاضری کے ہی جے این یو نے حاصل کیا تھا۔

جے این یو انتظامیہ کی دلیل یہ ہے کہ لازمی حاضری سے تعلیم وتحقیق کا معیار بڑھے گا اور جو لوگ اس کی مخالفت کر رہے ہیں ان کی تعداد بہت کم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جے این یو کی اکثریت نے حالیہ ریفرینڈم میں لازمی حاضری کو پوری طرح سے خارج کر دیا ہے۔ 98 فیصدی طلبا نے لازمی حاضری کی مخالفت میں اپنی رائے دی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جے این یو انتظامیہ کی دلیل کھوکھلی ہے۔ مدھو کشور جو جے این یو اکیڈمک کاؤنسل کی رکن اور رائٹسٹ نظریہ کی حامل ہیں انھوں نے بھی اپنے ٹویٹ میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ لازمی حاضری کو اکیڈمک کاؤنسل سے کبھی بھی پاس نہیں کرایا گیا۔ اس طرح یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ وائس چانسلر تمام قوانین کو بالائے طاق رکھ کر ایک خاص ایجنڈے کے تحت لازمی حاضری کو جے این یو میں تھوپ رہے ہیں۔

جب سے جگدیش کمار کو جے این یو کا وائس چانسلر بنا کر بھیجا گیا ہے تبھی سے انھوں نے ایک کے بعد ایک ایسے فیصلے لیے ہیں جس سے جے این یو کو بڑا نقصان ہوا ہے۔ جب وہ آئے تو انھوں نے پولیس بلا کر اپنے ہی طلبا یونین کے صدر کو گرفتار کروا کر پورے جے این یو پر غدار وطن ہونے کا الزام لگا دیا۔ اس کے بعد انھوں نے ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ہزاروں سیٹیں ختم کر دیں۔ اب ریزرویشن کو بھی نافذ نہیں کیا جا رہا ہے جس کی وجہ سے جے این یو کے دروازے محروم طبقات کے لیے تقریباً بند ہوتے دکھائی دے رہے ہیں۔ ہر روز ایک نیا چارج طالب علم پر تھوپا جا رہا ہے اور ٹیوشن فیس میں بھی ایک بڑا اضافہ کسی وقت کیا جاسکتا ہے۔ ان تمام کاروائیوں کو وی سی یونیورسیٹی کے اندر فنڈ پیدا کرنے کے نام پر صحیح بتا رہے ہیں اور ان کی دلیل ہے کہ تعلیمی ادارے کو اپنا خرچہ خود اٹھانا چاہیے۔ مگر وہیں دوسری طرف اسی ادارے میں لاکھوں کروڑوں کا سرکاری مال بھاجپا سیاستدانوں، بھگوا باباؤں کے پروگرام کو منعقد کرنے میں صرف کیا جا رہا ہے۔ لاکھوں روپے کبھی دہلی بی جے پی صدر اور مشہور بھوجپوری گلوکار منوج تیواری کے پروگرام میں خرچ ہو رہا ہے تو دوسری طرف شری شری روی شنکر کی تقریر کے نام پر کئی لاکھ پانی کی طرح بہا دیئے جاتے ہیں۔ اس طرح کے سیاسی پروگرام کرنے کے لیے جے این یو وی سی کے پاس فنڈ تو ہے مگر طالب علم کو اسکالرشپ اور بنیادی سہولیات دینے کے لیے ان کے پاس کوئی فنڈ نہیں ہے۔ حالت اس قدر خراب ہوچکی ہے کہ جے این یو کے میس میں انڈے کی قیمت بازار میں انڈے کی قیمت کے مقابلے دو گنا بڑھا دی گئی ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ اعلیٰ تعلیم کو فروغ دینے کے لیے طلبا کو مزید سہولیات دی جائے۔ زیادہ سے زیادہ تعلیمی ادارے ملک کے کونے کونے میں کھولے جائیں مگر اس طرف نہ تو حکومت کام کر رہی ہے اور نہ ہی انتظامیہ۔ ساری کی ساری توانائی طلبا کو ڈسپلن کرنے میں خرچ کی جا رہی ہے۔ لازمی حاضری کو بھی اسی سیاق میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔

ونٹر سمسٹر کے اختتام میں تقریباً ایک مہینہ بچا ہے مگر جے این یو میں درس و تدریس ابھی بھی بری طرح سے متاثر ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں طلبا لازمی حاضری یعنی Compulsory Attendance کی مخالفت میں اتر آئے ہیں۔ ہر روز جگہ جگہ پر اس کی مخالفت میں احتجاجی نعرے بھی بلند کیے جا رہے ہیں۔ مخالفت کرنے والوں میں تمام طلبا تنظیمیں - لیفٹسٹ، لبرل اور رائٹسٹ - شامل ہیں۔ ان کا یہی مطالبہ ہے کہ انتظامیہ اس طلبا مخالف فرمان کو فوراً واپس لے کیوں کہ جے این یو میں غیر حاضری کبھی کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ خیال رہے کہ جے این یو انتظامیہ نے سب سے پہلے 22 دسمبر 2017 کو ایک سرکولر جاری کیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ گریجویٹ، پوسٹ گریجویٹ طلبا ہی نہیں بلکہ ایم فل اور پی ایچ ڈی ریسرچ اسکالروں کو بھی لازمی حاضری دینی ہوگی۔ انتظامیہ اس سرکولر کو لے کر اڑا ہوا ہے اور اسے واپس نہ لینے کے لیے وہ ہر طرح کے حربے استعمال کر رہا ہے۔ انتظامیہ کو چاہیے تھا کہ وہ طلبا اور اساتذہ کی بات کو سنے اور ان کے ساتھ مکالمے میں جائے مگر اس کے برعکس دھمکی اور پولیس کے ڈنڈے سے ڈرا کر طلبا کو خاموش کر دینا چاہتا ہے۔ انتظامیہ کی طرف سے طلبا کو یہاں تک کہا گیا ہے کہ اگر انھوں نے اپنی حاضری نہیں دی تو انھیں ہاسٹل سے باہر کر دیا جائے گا، ان کا وظیفہ روک دیا جائے گا اور انھیں طبی سہولیات سے بھی محروم کر دیا جائے گا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ان تمام طلبا مخالف اقدامات کو انتظامیہ یہ کہہ کر جائز ٹھہرا چاہتا ہے کہ یہ طلبا کے فلاح و بہبود کے لیے اٹھائے گئے ہیں۔ انتظامیہ کی دلیل ہے کہ لازمی حاضری، ڈراپ آؤٹ کے مسئلے کو ختم کر دے گی اور پی ایچ ڈی جلد پورا کرنے میں مددگار ثابت ہوگی۔ مگر انتظامیہ کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ وہ اپنی بات کو آگے تو رکھ سکتا ہے مگر اسے کسی پر تھوپ نہیں سکتا۔ اگر انتظامیہ ڈراپ آؤٹ کے مسئلے کو لے کر واقعی فکرمند ہے تو وہ اس پر مذاکرہ کرنے سے کیوں کترا رہا ہے؟

اس فیصلے کو لے کر جے این یو طلبا کے اندر زبردست غم وغصہ پایا جا رہا ہے۔ انھوں نے بہت سے ایسے واجب سوالات اٹھائے ہیں جن کا کوئی جواب انتظامیہ کے پاس نہیں ہے۔ جیسے اگر لازمی حاضری کو ان پر تھوپ دیا گیا تو وہ فیلڈ ورک پر کیسے جائیں گے؟ تاریخ اور سماجیات کے طالب علموں کو کئی سارے آرکائیوز میں جانا پڑتا ہے۔ اگر وہ ہر روز حاضری لگانے کے لیے اپنے سینٹر آئیں گے تو وہ آرکائیوز اور دیگر کتب خانوں میں کب جا پائیں گے؟ اس کے علاوہ طلبا اس فرمان کو جے این یو کے آزاد اور روشن خیال کردار پر ایک بڑا حملہ مانتے ہیں اور اسے طلبا سیاست کو ختم کا ایک بہانا تصور کرتے ہیں۔

اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ خوف اور پہرے کے ماحول میں تنقیدی ڈسکورس کی گنجائش نا کے برابر ہو جاتی ہے۔ قومیت کی سیاست کرنے والی فرقہ پرست جماعت یہ بھول جاتی ہے کہ قومی شاعر رویندر ناتھ ٹیگور نے ایک ایسے بھارت کا خواب دیکھا تھا جہاں سوچ پر پہرہ نہ ہو اور علم کو محدود نہ رکھا جائے۔

اگر انتظامیہ کو لگتا ہے کہ لازمی حاضری سے جے این یو کا تعلیمی معیار بڑھ جائے گا تو کیا وہ اسے ثابت کرنے کے لیے کسی سائنٹفک مطالعہ کا حوالہ دے سکتا ہے؟ کیا انتظامیہ سائنٹفک اور منطقی دلیل کی بنیاد پر یہ ثابت کر سکتا ہے کہ اس طرح کے اقدامات نے تعلیم و تحقیق کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ آج جب ماہر تعلیم اوپن لرننگ، امتحان اور گریڈ سے پرے تعلیم کی بات کر رہے ہیں تو وہیں جے این یو انتظامیہ اس سمت میں پہل کرنے کے بجائے الٹی دوڑ لگا رہا ہے۔

انتظامیہ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ جے این یو کا کلاس روم اور سیمینار ہال اکثر ہی طلبا سے کھچا کھچ بھرا ہوتا ہے۔ نیلا دری بھٹاچاریہ، ابھجیت پاٹھک، نویدیتا مینن، گوپال گرو، اتساہ پٹنائک، پربھات پٹنایک جیسے پروفیسر طلبا میں اتنے مقبول ہیں کہ ان کے کلاس میں نہ صرف متعلقہ کلاس بلکہ دوسری جماعتوں کے طلبا بھی شامل ہو کر ان سے مستفید ہوتے ہیں۔ جے این یو آنے سے قبل میں ان اساتذہ کے بارے میں سن چکا تھا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں میرے سینئر ان کے لکچرز سننے کے لیے جے این یو آتے تھے۔

جے این یو میں طلبا کا ذوق وشوق تو یہ ہے کہ وہ اپنی مرضی اور دلچسپی کو مدنظر رکھتے ہوئے مختلف کورسز کو چنتے ہیں۔ میں نے بھی اپنے ایم۔ اے اور ایم فل کورسز کے دوران بہت سے ایسے اضافی کورسز لیے تھے جن کا میرے نصاب سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ اساتذہ بھی اپنی طرف سے اضافی کلاسز لیتے ہیں۔ یہ سب کچھ لازمی حاضری کے نفاذ سے پہلے جے این یو میں بہت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ چل رہا تھا۔

حکومت کو چاہیے کہ وہ سیاسی مفادات سے بالاتر ہو کر اپنے آئینی و عوامی فرائض کو نبھائے۔ اسے چاہیے کہ اس معاملے میں مداخلت کرے اور جے این یو کے کردار کو برباد ہونے سے بچائے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جے این یو جیسے ادارے ملک کے دیگر مقامات پر کھولے جائیں۔ اسے تباہ کر کے مخصوص سیاسی فائدہ تو اٹھایا جا سکتا ہے مگر اس سے ملک کا بہت بڑا نقصان ہوگا۔ انتظامیہ کو بھی اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ اس کا رول یونیورسٹی میں جتنا ہی محدود ہوا اتنا ہی تعلیم اور تحقیق کے لیے بہتر ہے۔ مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ اس کی مداخلت ہر روز بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ ابھی حالیہ دنوں میں جے این یو انتظامیہ نے تقریباً آدھے درجن ڈیپارٹمنٹ کے چیئر پرسن اور اسکول کے ڈین (Dean) کو ہٹانے کا فرمان صرف اس لیے جاری کر دیا ہے کہ یہ لوگ انتظامیہ کے اشارے پر نہیں ناچ رہے تھے۔ اس کے خلاف جے این یو میں طلبا پورے زور وشور سے مزاحمت کر رہے ہیں مگر ان کی کامیابی بہت حد تک ملک کی سیاسی تبدیلی پر بھی منحصر ہے۔

نام کتاب: اقامت دین کا اغوا

مصنف: خان یاسر

صفحات: 38

زبان: اردو

ناشر: اِلِاکسیر پبلیکیشن

مبصر: عبید الرحمان نوفل

اقامت دین ایک دینی فریضہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ کسی تفریق و تقسیم کے بغیر پورے دین کی مخلصانہ پیروی کرے اور اسے انسانی زندگی کے انفرادی اور اجتماعی تمام شعبوں میں نافذ کرنے کی حتی المقدور کوشش کرے۔ اس کتاب میں اقامت دین سے ہی متعلق دو حکایتیں سنائی گئی ہیں جن کی ابتداء ایک ہے، کہ ایک مسلمان جس کے بیٹے اقامت دین کو جاہلیت اس وقت اغوا کر لیتی ہے جب مسلمان دنیا و مافیہا کے چکر میں پڑ کر اقامت دین سے غافل ہو گیا تھا۔ ایک ہی ابتدا سے شروع ہونے والی دونوں حکایتیں دو مختلف انجام کی طرف جاتی ہیں۔ پہلی کہانی میں مسلمان اپنے بیٹے کے اغوا ہو جانے کے بعد روتا چیختا ہے، اس کے دوست مفکر، بزرگ اور خیر خواہ اسے تسلی دیتے ہیں، جاہلیت سے سمجھوتہ کرنے تو کبھی بیٹے پر صبر کرنے کی نصیحت کرتے ہیں۔ کبھی مسلمان کے بیٹوں کے مشکل نام پر اعتراض کرتے ہیں تو کبھی اس بات پر بحث کرتے ہیں کہ آیا مسلمان کو اپنے بیٹے کو بچانے کے لیے جاہلیت سے لڑ جانا چاہیے تھا یا نہیں۔ جب کہ مسلمان کا عمل پسند دوست رضا کار اقامت دین کو بھولنے کے بجائے اس کو پانے کے لئے اپنی سی کوشش کرتا ہے، لیکن اس کی اکیلے کی کوشش زیادہ مفید ثابت نہیں ہوتی، کبھی وہ جاہلیت کے خلاف احتجاج کرتا ہے تو کبھی اپنے دوستوں کو اقامت دین کو پانے کے لیے کچھ کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ دین کے قائم نہ ہونے کی صورت میں تحریک اسلامی کے افراد دین کی اقامت کی کوشش کرتے ہیں۔ درحقیقت پہلی حکایت اقامت دین کے تئیں مسلمانوں کے موجودہ رویہ کو ظاہر کرتی ہے کہ جہاں کوئی خیر خواہ مسلم جاہلیت سے مداہنت کی طرف دعوت دیتا ہے تو کسی مسلم مفکر کو اس بات پر ہی اعتراض ہے کہ مسلمان امر بالمعروف و نھی عن المنکر اور شہادت حق کی باتیں کیوں کرتے ہیں، وہ کیوں اقامت دین کو اپنا مقصد بتاتے ہیں، کیوں نہ وہ سوشل سروس، لبرٹی اور پیس (peace) کی باتیں کرتے۔ تو کہیں امت کے بزرگ حضرات یہ نصیحت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ مسلمانوں کو امر بالمعروف اور شہادت حق ہی تک محدود رہنا چاہئے اور آج کے جاہلیت زدہ دور میں اقامت دین جیسے ناممکن کام کا خیال بھی اپنے ذہن سے کھرچ کر نکال دینا چاہیے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کی ہم اس دور کے مسلمانوں کی پالیسی اور دستور العمل میں لفظ اقامت دین لکھا ہوا بھی نہیں پاتے۔ دوسری حکایت کی بھی ابتدا اقامت دین کے اغوا سے ہوتی ہے لیکن اس کا انجام مختلف ہوتا ہے کیونکہ اس میں مسلمان اپنے بیٹے اقامت دین پر رونے چیخنے اور اس کو بھول جانے کی کوشش کرنے کے بجائے اس کو جاہلیت سے چھیننے کے لیے دوڑ پڑتا ہے۔ اس کے احباب بھی اپنی اپنی جگہ اقامت دین کو پانے کے لیے مختلف کوششیں کرتے ہیں اور پھر اللہ کی مدد ان کے شامل حال ہوتی ہے اور وہ اقامت دین کو پانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ یہ حکایت اقامت دین کے تئیں ہمارے مطلوبہ رویہ کو ظاہر کرتی ہے کی دین کے قائم نہ ہونے کی صورت میں مطلوب یہ ہے کی سماج کا ہر شخص اپنے اپنے میدان میں ہی دین کی اقامت کے لیے کوشش کرے۔ سماج کے بزرگ حضرات دعوت دین اور خدمت خلق کے ذریعہ غلبہ دین کے لیے کوشاں ہوں تو وہیں مفکرین ملت حکم خداوندی (اَنْ اَقِیمُوا الدِّین) کی بجا آوری کے لیے پلاننگ اور لوگوں کی رہنمائی کریں اور بالخصوص تحریک اسلامی کے افراد اپنے میدان کار سماج میں اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے کوشش کریں، جس کے لیے وہ فوراً سیاست کی بھیڑ میں کودنے کے بجائے ایکٹوزم کے لمبے اور مشکل راستے کو طئے کرنے کے بعد سیاست میں قدم رکھیں۔ اس کے بعد ہی اللہ کی موعودۃ مدد آئے گی اور دین کا قیام ممکن ہوگا۔ اقامت دین کے تئیں مسلمانوں کے موجودہ رویے سے مطلوبہ رویے تک سفر لمبا اور دشوار کن ہے اور یہ دشواری اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ امت کے صرف چند لوگ ہی اپنے مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور بقیہ دو طبقے، جن میں سے ایک کا خیال تو یہ ہے کی دین صرف پرائیویٹ معاملے تک ہی محدود ہے، تو دوسرا طبقہ اسلام کو مکمل نظام حیات تو مانتا ہے لیکن اس کے قیام کی کوشش کو ضروری نہیں سمجھتا۔ اب تیسرے طبقے، (جن کا اس پر مکمل یقین ہے کہ دین اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور اس کے قیام کی کوشش ہر مسلمان پر فرض ہے) کی ذمہ داری ہے کی وہ سماج کے بقیہ دو طبقوں کو اپنا ہم خیال بنائے، انہیں ان کا بھولا ہوا فرض یاد دلائے تا کہ سماج کا ہر فرد اپنے اپنے میدان کار میں غلبہ دین کی کوشش کرے اور ایک بار پھر اللہ کا دین غالب ہو جائے۔ زیر تبصرہ کتاب برادر خان یاسر کی ہے۔ انہوں نے یہ کتاب بالکل نئے اور جداگانہ انداز میں تحریر کی ہے جس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں، اس کتاب کو پڑھنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ اس کا ایک ایک لفظ بہت معنی خیز اور بڑے غور و فکر کے بعد استعمال کیا گیا ہے۔ امید ہے کہ یہ تحریک اسلامی کے افراد کے لیے ایک قیمتی تحفہ ثابت ہوگی اور منزل سے ناامید یا کسی تھکے ہارے مسافر کے دل میں پھر سے دوڑ پڑنے اور دوڑتے رہنے کا خیال پیدا کرے گی۔

تعمیری دوستی

سلیمان خان، نظام آباد

دوست کے معنی ہم راز اور رازدار کے ہے۔ راز ایک ایسا لفظ ہے جس کی سماعت سے انسان اپنے آپ میں خود کو غیر محفوظ خیال کرتا ہے کیونکہ اس کو اس بات کا خدشہ ہوتا ہے کہ کہیں وہ اُس راز کو راز باقی نہ رکھ پائے۔ دوست ایک ایسا لفظ ہے جس کو سننے پر اطمینان قلب بھی ہوتا ہے اور انسان خود کو خوش نصیب بھی محسوس کرتا ہے۔ کیونکہ دوستی ایک ایسا واحد رشتہ ہے جہاں انسان اپنے سارے کاموں کا تذکرہ کرتا ہے، چاہے وہ مثبت ہو یا منفی، وہ جانتا ہے کہ اس کا رفیق اس کے خیالات کو سمجھے گا، اس کو اس کی سوچ کے مطابق صحیح راہ بتائے گا، اور اپنے دوست کے ان تمام خیالات کو سن کر اس کو اس راہ کے لئے رہنمائی کرے گا جو اس کے لیے بہتر ہو۔ یہ وہ مقام ہوتا ہے جہاں آدمی خود کو غیر معمولی طور پر محفوظ پاتا ہے، اپنی تمام باتوں کو کھل کر بیان کرتا ہے اور اس کے حل کے لئے اپنے دوست کی رائے کو اوّل درجہ دیتا ہے اور اس پر عمل بھی کرتا ہے کیونکہ اس کو اپنے دوست پر کامل یقین ہوتا ہے کہ میرا ساتھی میرے لئے مفید اور مثبت مشورہ ہی دے گا۔ یہی وجہ ہے جس کے لیے زندگی میں ایک مخلص دوست کا ہونا ضروری ہے اور یقینا ایک اچھا دوست زندگی کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ انسانی زندگی میں دوست ایک ایسا رشتہ ہے جہاں ایک فرد کا دوسرے فرد سے آپس میں نہ تو خونی رشتہ پایا جاتا ہے اور نہ ہی ایک فرد دوسرے فرد سے سماجی قانون سے جکڑا رہتا ہے، جہاں ہر لحاظ سے اسے پکڑا جائے، اس کو پوری چھوٹ اور مکمل آزادی ہوتی ہے کہ اس کو اپنے دوست کے ساتھ کے ساتھ کیسا رشتہ رکھنا ہے، اسے کتنا وقت اس کے ساتھ صرف کرنا ہے، اس کی کتنی مدد کرنی ہے اور اس کی کتنی قدر کرنی ہے۔ عام طور پر دیکھنے کو ملتا ہے کہ اس وقت دوستی کا معیار تبدیل ہو رہا ہے اور بہت تیزی کے ساتھ یہ سوچ پروان چڑھ رہی ہے کہ دوستی ایک ایسے فرد سے ہو جو مالدار ہو، جس کے پاس موٹر سائیکل ہو، جو مشہور و معروف ہو، جس کی دوستی سے آپ کو شہرت ملے، جو آپ کے اخراجات کی تکمیل کا ذریعہ بنے۔ یہ چیزیں اگر کسی کے پاس ہوں تو اس سے دوستی کرنے کے لئے لوگ مرے جاتے ہیں۔ دوستی کے لیے ایسا معیار اور اس طرح کے خیال رکھنے والے افراد کو یہ طے کر لینا چاہیے کہ وہ اپنی شخصیت کو چند دنوں کے آرام اور معمولی شہرت کے بدلے بڑے سستے داموں میں فروخت کر رہے ہیں۔ وہ اپنی خود اعتمادی کو پوری طرح مار رہے ہیں، آج کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے جس کی وجہ سے لوگ ایک اچھا اور مخلص دوست بنانے میں ناکام ثابت ہو رہے ہیں۔

جبکہ مثبت اور تعمیری دوستی کے لیے ضروری ہے کہ دوستی ایسے فرد سے ہو جو مخلص طبیعت کا مالک ہ، جو آپ کو اور آپ کے خیالات کو سمجھے، آپ کی اصلاح کرے، آپ کے جذبات کی قدر کرے، آپ کو اور آپ کی صلاحیتوں کو جانے اور اس کو مثبت رُخ دینے کی کوشش کرے، آپ کی غلطیوں پر متنبہ کرے اور آپ کے لیے وہ صورت اختیار کرلے جسے حدیث میں آئینے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا کہ ایک مومن دوسرے مومن کے لیے آئینہ ہے۔ حدیث میں آئینہ کی مثال یہ سمجھاتی ہے کہ جب انسان آئینے میں دیکھتا ہے تو آئینہ اس کی حقیقی شکل دکھاتا ہے اگر چہرے پر داغ ہو تو وہ داغ چھپاتا نہیں بلکہ اس کو بالکل ویسا ہی دکھاتا ہے جیسا وہ ہے، لیکن انسان کبھی آئینہ پر غصہ ہو کر اس کو توڑتا نہیں بلکہ وہ اپنے داغ کو قبول کرتا ہے اور کو صاف کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح ایک دوست جب غلطی کرے تو اس کے دوست کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کی غلطی کو بتائے۔

نبی کریمؐ کا ارشاد ہے کہ آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے، اس لیے ہر آدمی کو غور کرلینا چاہیے کہ وہ کس سے دوستی کر رہا ہے۔ (مشکوٰۃ) دوست کے دین پر ہونے کے معنی یہ ہیں کہ جب وہ دوست کی صحبت میں بیٹھے گا تو وہی جذبات اور خیالات اور وہی ذوق اور رجحان اس میں بھی پیدا ہوگا جو دوست میں ہے اور پسند اور ناپسند کا وہی معیار اس کا بھی بنے گا جو اس کے دوست کا ہے، اس لیے دوست کے انتخاب میں نہایت غور وفکر سے کام لینا چاہیے اور قلبی لگاؤ اس سے بڑھانا چاہیے جس کا ذوق اور رجحان، افکار وخیالات، دین اور ایمان کے تقاضوں کے مطابق ہو۔

حضرت سعید بن المُسیبؒ نے حضرت عمر فاروقؓ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ ''اچھے اور سچے دوست بناؤ، ان کے سائے میں زندگی کے دن گزارو کہ وہ عیش کے وقت زینت اور مصیبت کے وقت سراپا مدد ہیں،

جب بھی تم اپنے دوست کے متعلق بری خبر سنو تو اس کی بہتر تاویل کیا کرو، مگر یہ کہ تمہیں اس کی برائی کا یقین ہو جائے، اپنے دشمن سے دور رہو اور اس دوست سے بھی بچو جو امین نہ ہو اور امین صرف وہی شخص ہے جو اللہ سے ڈرے، بدکار کی صحبت سے گریز کرو، ورنہ تم اس کی بد کاری سیکھ جاؤ گے، اسے اپنا راز دار مت بناؤ، مشورہ صرف ان لوگوں سے کرو جو اللہ سے ڈرتے ہوں''۔

ان بنیادوں اور اصولوں پر جو دوستی قائم ہوتی ہے وہ ایک کامیاب اور مثالی دوستی ہوتی ہے۔ جس کی مثال نبیِ کریم صلعم کی سیرت مطہرة میں ملتی ہے۔ آپؐ اور حضرت ابوبکرؓ کی دوستی ایک مثالی دوستی تھی۔ ابوبکرؓ اور اللہ کے رسولؐ کی دوستی ناپی نہیں جاسکتی، صرف مثال ہی دی جاسکتی ہے۔ ایک مشہور واقعہ کہ جب آپؓ کو دین اسلام اللہ کے نبیؐ نے سمجھایا اور اسلام لانے کی دعوت دی تو آپؓ بغیر سوچے سمجھے ایمان لے آئے کیونکہ آپؓ کو نبی کریمؐ پر مکمل اعتماد اور بھروسہ تھا۔ یہ ایسی دوستی تھی کہ جب بھی نبیؐ نے آپ کو آواز لگائی آپؓ حاضر ہو جاتے یہاں تک کہ ہجرت کے موقع پر بھی حضرت ابوبکر صدیقؓ آپؐ کے ساتھ تھے تبھی اللہ کے رسولؐ نے کہا تھا کہ میں زندگی میں دو لوگوں کا احسان نہیں چکا سکتا ایک آپؐ کی زوجہ حضرت عائشہؓ اور دوسرے آپؐ کے یارِ غار حضرت ابوبکر صدیقؓ۔

دوستی ایک اچھے مقصد کے لئے ہو تو بہت فائدہ مند ہوتی ہے اور دوست کے ساتھ سب سے بڑی خیر خواہی یہ ہے کہ آپ اس کو اخلاقی اعتبار سے زیادہ سے زیادہ اونچا اٹھانے کی کوشش کریں اور اس کی دنیا بنانے سے زیادہ اس کی آخرت بنانے کی کوشش کریں، خیر خواہی کا اصل معیار یہ ہے کہ آپ اپنے دوست کے لیے وہی پسند کریں جو اپنے لیے پسند کرتے ہوں، اس لیے کہ آدمی اپنا برا کبھی نہیں چاہتا۔ کہا جاتا ہے کہ دوستی دریا کے مانند ہوتی ہے جو مخصوص راستے میں بہتی ہے اگر راستہ ہموار ہو تو آسانی سے بہتی ہے اور اگر مشکل ہو تو مشکل سے بہتی ہے، اگر دریا گاؤں سے گزرتی ہے اور اپنے قرب و جوار کے کھیتوں کو سیراب کرنے کی صلاحیت اس میں نہیں ہے، یا بالفاظ دیگر اس دریا کا پانی فائدہ مند ہونے کے بجائے کھیتی کے لیے نقصاندہ ثابت ہو تو اس کا ہونا بے جا ہے۔ اُسی طرح ایک دوست اگر اپنے دوست کی صحیح سمت میں رہنمائی نہ کر سکے اور اس کے لیے مفید ہونے کے بجائے مضر ثابت ہو تو وہ دوست نہیں بلکہ دشمن ہے۔ مخلص اور اچھا دوست کتابوں سے زیادہ فائدہ مندہ ہے۔ اے پی جے عبدالکلام کا مشہور قول ہے کہ '' ایک بہترین کتاب سو اچھے دوستوں کے برابر ہے لیکن ایک مخلص دوست ایک لائبریری کے برابر ہے''۔

اب اگر کوئی شخص کسی سے دوستی قائم کرتا ہے تو اسے کم از کم اس معیار کو مدنظر رکھنا چاہئے کہ اس کا دوست اسے اچھے کاموں کے بجائے کہیں برے کاموں کی طرف راغب تو نہیں کر رہا ہے۔ وہ میری ذات میں بری صفات پیدا کرنے کا ذریعہ تو نہیں ہے، اس کی دوستی مجھے میری تعلیم اور مقاصد زندگی سے غافل تو نہیں کر رہی۔ دوست وہ نہیں ہوتا جو آپ کو ضائع کردے بلکہ دوست وہ ہوتا ہے جو آپ کو اور آپ کی زندگی کو کامیابیوں کی طرف لے کر جائے، اور ایسی ہی دوستی تعمیری دوستی ہے۔

وارث بدر واحد ہو تم

شہمینہ سبحان، ریاض

گھپ سناٹا، تاریک رات، ہر طرف گھپ اندھیرا تھا ظلمتوں کا دور دورہ تھا، جہل اپنے عروج پر تھی مختلف قسم کے 'سامری' بنا لئے گئے تھے ان کا دین، ان کا مذہب ان کی مرضی کا مالک ہو گیا تھا وہ مختلف خرافات میں ملوث ہو کر اپنی 'اصل' سے ہٹ گئے تھے ان کی ظاہری انسانی حیثیت اور شکلوں میں بس وہ انسان باقی رہ گئے تھے۔ ہر طرف گہرا اندھیرا اور جہل جب جب بڑھتی رہی تو ان وقتوں میں اللہ تعالی کی ہمیشہ سنت یہ رہی ہے کہ ایک رہنما بھیج کر اس ظلمت کو مٹانے کا سبب بنایا جائے۔

ایسے میں انھیں ایک مجدد و مصلح کی شدید ضرورت تھی اور اس تاریک و گہری شب کے پردے پر خدائے رب و رحمن نے 'روشنی' کو نمودار کیا تا کہ وہ ان اصل سے ہٹ جانے والوں کے لئے راستی کا، خدا ترسی کا پیغام لیکر آئے اس کے مخاطب دنیا جہاں کے لوگ تھے اس کے اپنے وطن کے، قبیلے کے لوگ بھی تھے وہ روشنی مستقبل کے بطن میں پوشیدہ سارے زمانوں کے لئے تھی، وہ ساری انسانیت کے لئے تھی کہ وہ صفاء سے قیامت تک آنے والی بنی نوع انسان کی ساری نسلوں کے لئے تھی تا کہ ظلمتوں کا خاتمہ ہو سکے۔ اس کا خطاب زندگی کے آخری کنارے تک کے لئے تھا، ان سب کے لئے جو پیدا ہو چکے تھے اور جو عالم وجود میں آنے والے تھے۔ نسل در نسل!! عصر بہ عصر!!

اور پھر اسی طرح ہوا زمانہ در زمانہ، پیغام پھیلتا چلا گیا سلیم الفطرت لوگ اس کے گرد جمع ہوتے گئے اور سیکھ سیکھا کر تربیت یافتہ ہو کر دنیا کے ملکوں میں پھیلتے چلے گئے اس کے نام لیوا کبھی مشرق میں ہندوستان تک، کبھی شمال میں ازبکستان و تاجکستان تک، کبھی جنوب میں افریقہ کے ریگزاروں تک اور تو کہیں مغرب میں اسپین کی سرحدوں کو چھو لیا۔

جہاں جہاں اس کے نام لیوا پہنچے ان کے بلند ترین اخلاق نے اسلام کی صداقت کو وہاں بسنے والوں کے سامنے واشگاف کیا وہ اس دین کو اپناتے چلے گئے اور پھر انھوں نے بھی اس دین کے لیے نمایاں خدمات انجام دیں علوم و فنون میں مہارت پیدا کی فتوحات کے جھنڈے گاڑ دیئے اور وہ اپنی زمینوں میں جہاں وہ بستے تھے ان کے حوالے سے وہ پہچانی جانے لگیں نئے جہاں انہوں نے آباد کیے۔

مدتوں ہوئی ان کو وہاں بسے ہوئے، ان کی کتنی ہی نسلوں نے وہاں جنم لیا، وہ ان زمینوں سے پیوست ہو گئے تھے۔ لیکن پھر یہ ہوا کہ وہ اپنی ہی زمینوں میں 'زندگی' کے حق سے محروم کیے جانے لگے وہ درد سے چور، ان کی نسلیں سہمی ہوئی، ان کے گھر تباہ و برباد۔

عیش کوشی 'سہولت پسندی' بز دلی ان کا خاصہ بن چکی تھی دشمنوں نے ان کے گھر پہ قبضہ کیا تھا تو وہ دیوار گریہ کے پاس جمع ہوئے اور انھوں نے ان محرومین کی بے بسی کا یوں مذاق بنایا تھا،

" آج کا دن خیبر کے دن کا بدلہ ہے، خیبر کا انتقام لیا جا چکا ہے انہوں نے مزید یہ کہا تھا محمدؐ کا انتقال ہو چکا ہے اور وہ اپنے پیچھے بیٹیاں چھوڑ چکے ہیں۔" العیاذ باللہ

اس تمام صورت حال پر ایک اسلامی شاعر کا ایک شاندار لیکن غم ناک قصیدہ قابل غور ہے جس میں انہوں نے رسول اللہ صلعم کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا۔ اے میرے آقا! اے میرے آقا!! صلی اللہ علیہ وسلم!" "آپ پر تا ابد بہترین صلوۃ و سلام نازل ہوتا رہے ایک ایسی امت کی جانب سے جواب تباہ و برباد ہو چکی ہے اسے ظلمت اور تباہی و بربادی کی تہذیب و ثقافت (یورپی تہذیب) ٹھوکریں پر ٹھوکریں لگا رہی ہے۔

اے میرے آقا!! اگر چہ ہم نے دریاؤں پر بند باندھے ہیں اور سمندروں کو عبور کیا ہے لیکن اس کے باوجود آپ کے اور ہمارے درمیان رکاوٹیں حائل ہو چکی ہیں اور ان رکاوٹوں کی وجہ سے آپ صلعم کے اور ہمارے مابین اس جدائی اور ان فاصلوں نے ہم پر موت طاری کر دی ہے یہی وجہ ہے کہ اب ہمیں یہودیوں کے مویشی بھی اپنے پاؤں تلے روندتے چلے جا رہے ہیں۔"

قیصر و کسری کو فتح کرنے والی یہ امت جنہوں نے دنیا میں انقلابات کے دروازے کھول دیئے تھے علوم و فنون کے ماہرین پیدا کرنے والی یہ امت بے یار و مددگار، اپنے ہی ملکوں میں جس کی زمینوں کو انھوں نے اپنے خون جگر سے سینچا تھا وہی اب زندگی کے حق کے لئے ترستے ہوئے ہیں۔ انحطاط اور ذلت کی حد یہ ہے کہ ان کی وفاداری کی ان کو کہیں شہادت دینی پڑتی ہے اور کہیں حب الوطنی کو ثابت کرنا پڑتا ہے۔ اور اب حال یہ ہے کہ جہاں وہ بستے ہیں وہاں اب ان کی قبریں رہ گئی ہیں جن کے نشان گنے جا چکے ہوں۔ اور یہ نشان کبھی (ماضی میں) قرطبہ کی طرف لے جاتے ہیں تو کبھی بیت المقدس کی طرف، کبھی قندھار کبھی کشمیر، برما اور کبھی حلب کی طرف۔ ان نشانوں کی تاریخ تلاش کرتے ہوئے ڈائری ڈھونڈتی ہوں تو، ڈائری (قرآن) ڈائری تو گم ہو گئی، صدیاں کھو گئی۔

قومیں جب اپنی 'اصل' سے ہٹ جاتی ہیں تو پھر ان کی تاریخ کھو جاتی ہے اور وہ بہت بے وقعت ہو کر رہ جاتی ہیں بہت ہی بے بس!!

ان کی زبانیں حق گوئی سے محروم، ان کے سر جھکے ہوئے اور وہ اپنی ہی ہاری ہوئی جنگیں لڑنے لگ جاتی ہیں، باطل کے آگے سرنگوں، ان کی بخششوں (ڈالرس) کے عوض اپنے سودے کرنے والی، ان ہی بخششوں کے حوالے سے اسلحہ بارود و پینٹنگس خریدنے والی اس مردہ و بے اختیار امت (جس کے تمام فیصلے مغرب کے اداروں میں ہوتے ہیں) میں سے کوئی مصلح اٹھے اور اس امت کو یاد دلائے کہ یہ دنیا ہمارے لئے جائے قیام نہیں۔۔۔!

اٹھو اور با اختیار لوگوں کی طرح فیصلے کرتے ہوئے اس دنیا میں اپنے وجود کا احساس دلاؤ۔۔۔۔!!

اور یاد رہے مصلح یا مجددیوں ہی نہیں اٹھتے اس امت کی ماؤں کو یہ کام کرنا ہے اور اس امت کے باپوں کا بھی یہ فریضہ ہے کی وہ اپنی آنے والی نسلوں میں اپنی بہترین وراثت منتقل کریں ان کو صداقت، شجاعت، تقدس کے اسباق پڑھائیں۔ ان کو یہ یاد دلائیں کہ حکمت مومن کی میراث ہے اور شہادت منزل!!

جو قوم دنیا میں عدل و اعتدال کی امانت لے کر آئی تھی اور جس سے دنیا کی قوموں نے میانہ روی، راستی کا سبق سیکھ کر تہذیب و ثقافت کی منزلیں طے کیں اسی امت کے نوجوانوں کو اٹھنا ہے کہ گویا۔۔۔

اٹھو و گرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

شیخ احمد ضیاء تلنگانہ

آج مرزا سے جب ہم ملے وہ کچھ گنگنا رہے تھے اور بڑے خوشگوار موڈ میں دکھائی دے رہے تھے۔ ہمارے استفسار پر کہنے لگے میاں اکبرالہٰ آبادی بھی بڑی پتے کی باتیں کہہ گئے ہیں ہمیں آج ان کا ایک شعر یاد آ گیا جو ہم صبح سے گنگنا رہے ہیں اور مزے لوٹ رہے ہیں۔ ہم نے کہا آخر وہ کونسا شعر ہے جو آپ جیسے ادب بیزار شخص کو اتنا مسحور کر رہا ہے۔ کہنے لگے میاں اکبرالہٰ آبادی نے برسوں پہلے آج کے معاشرہ کی حالت کو نظر میں رکھتے ہوئے کیا خوب کہا

''اٹھا کر پھینک دو ان کو گلی میں......نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے''

آج ہم اگر اپنے معاشرہ پر نظر ڈالیں تو پتہ چلے گا کہ ہمارے اسلاف نے گندے انڈوں کو گلی میں نہ پھینک کر بہت بڑی غلطی کی۔ اگر وہ بروقت فیصلہ کرتے اور اکبرالہ آبادی کی بات مان لیتے تب آج جو ہم معاشرہ دیکھ رہے ہیں وہ اس قماش کا نہیں رہتا۔ آج ہم جس معاشرہ میں زندگی گذار رہے ہیں ایسا لگتا ہے کہ وہ دن بدن اپنے اقدار کھو رہا ہے۔ معاشرہ کا ہر فرد ایک دوسرے کا دشمن بنا ہوا ہے۔ دوسروں کو ترقی کرتے ہوئے دیکھ کر خوش ہونا ہمارے بس میں نہیں رہا۔ انتہائی قریب ترین رشتہ دار ہو یا دوست، سب سے بدترین دشمن ثابت ہو رہا ہے۔ معاشرہ میں پھیلی ہوئی یہ برائی، نفسا نفسی کا عالم اور خودغرض ذہنیت کیوں پنپ رہی ہے۔ اگر ہم گہرائی سے جائزہ لیں تب پتہ چلے گا کہ ان تمام برائیوں کی جڑ ہے دولت سے رغبت اور کم سے کم وقت میں زیادہ زیادہ دولت بٹورنا۔ خواہ اس سے کسی دوسرے کا نقصان عظیم کیوں نہ ہوجائے۔ مادیت پرستی حد سے زیادہ بڑھ چکی ہے جو باہمی خلوص کو ختم کر رہی ہے دولت کی ہوس نے رشتوں کا تقدس ختم کر دیا ہے Financial Status ہی دراصل Social Status بن گیا ہے۔ جو شخص جتنا زیادہ دولت مند ہے وہ اتنا ہی معتبر اور معزز مانا جاتا ہے۔ دانشور غریب کو پاگل سمجھا جا رہا ہے اور پاگل رئیس کی باتوں کو فلسفہ کا نام دیا جا رہا ہے۔ دولت کی غیر مساوی تقسیم معاشرہ کو تباہی کے دہانے پر لا چکی ہے۔ امیر کا امیر ترین ہوجانا اور غریب کا غربت کی نچلی سطح کو چھو لینا معاشرہ کو تباہ و برباد کر رہا ہے۔ امیروں کی کندہ ناتراش اولاد فہم وادراک کے خانوں میں رکھی جا رہی ہے جبکہ ذہین ترین غریب نوجوان ٹھوکریں کھاتے پھر رہے ہیں۔ غریب گھرانوں کی حورنما دوشیزائیں تاحیات کنواری بیٹھ رہی ہیں اور رئیس گھرانوں کی بدصورت جاہل اور غیر معیاری لڑکیاں معزز گھرانوں کی بہو بننے کا شرف پا رہی ہیں۔

ہر شخص خود سے زیادہ امیر، خود سے زیادہ مشہور اور نامور شخصیت سے رشتہ جوڑنے کی فکر میں ہے اور اپنے سے کمتر کی سمت دیکھنا بھی ناگوار اور معیوب سمجھ رہا ہے۔ امیروں کی غلطی کو ہنر ٹھہرایا جا رہا ہے۔ امیروں کا اسراف سخاوت امیروں کی مکاری ہوشیاری اور امیروں کی بدچلنی کو تفریح کا نام دیا جا رہا ہے۔ رئیس گھرانوں کے جاہل لڑکے کپڑے کم اور موٹر گاڑیاں زیادہ بدل رہے ہیں جبکہ غریب نوجوان کسی اچھی کمپنی کی چپل خریدنے کی سکت سے بھی محروم ہو گئے ہیں۔ علماء، مشائخین اکابرین و امراء کے بچوں کا نکاح صرف دکھاوے کی خاطر مسجدوں میں انجام پا رہا ہے اور ڈنر کے مزے اشوکا، بنجارہ، ہلٹن اور اوبرائے جیسی فائیو اسٹاف ہوٹلوں میں لوٹے جا رہے ہیں۔ تقریب نکاح میں مختصر تعداد شریک ہوتی ہے اور ڈنر کے لئے شہر کا ہر نام نہاد معززین حاضر ہوجاتا ہے۔ دوسرے دن یہی معززا اصلاح معاشرہ کی ڈائس سے پُراثر اور بہترین لکچر جھاڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ بےعمل عالموں کی تعداد بڑھ گئی ہے جس کی وجہ سے معاشرہ پر کسی کی بات بھی اثر انداز نہیں ہو رہی ہے۔ بڑوں کا ادب اور چھوٹوں سے شفقت کے جذبے کا معاشرہ میں فقدان ہے۔ کوئی کسی کے قابو میں نہیں ہر شخص بے راہ روی کا شکار ہے۔ حصول تعلیم نمائش ہوگئی ہے لاکھوں روپیے خرچ کرتے ہوئے امراء اپنے ناقص الذہن بچوں کو فائیو اسٹار کالجوں کو بھیج رہے ہیں اور ان کی یہ بگڑی ہوئی اولاد کالجوں کے تعلیمی ماحول کو بگاڑنے کا ذمہ لئے ہوئے ہوتی ہے۔

بہترین ملبوسات بہترین سواری ایک ہاتھ میں سیل فون دوسرے ہاتھ میں کسی رئیس کی بگڑی ہوئی لڑکی کا ہاتھ غرض ایک طوفان بدتمیزی ہے جو پورے ماحول کو آلودہ کر رہا ہے۔ دوسری طرف غریب نادار ذہین ترین طلباء فیس کی کمی، کما کر خاندان کو پالنے کی فکر اور دوسرے تفکرات زمانہ کے باعث تعلیم ادھوری چھوڑ رہے ہیں۔ امیروں کو چھینک بھی آجائے تب شہر کے بڑے سے بڑے دواخانے تک رسائی اور غریب چھوٹے موٹے امراض کے لئے دوائی نہ ہونے کی وجہ سے صحت کو ترس رہے

ہیں۔ایک ماں اور بیٹی بازار میں جب نکل رہے ہیں ماں برقعے میں مکمل پردہ کی پابند دکھائی دے رہی ہے اور جوان بیٹی کسی فلمی ہیروئین کی مانند دعوت نظارہ دیتی ہوئی دکھائی دے رہی ہے۔سرپرست خاندان کا لفظ لغت سے غائب ہوگیا ہے نوجوانوں کی مختلف مذہبی جماعتوں سے وابستگی ایک رسم لگ رہی ہے یہ نوجوان مذہب کی روح سے کوسوں دور ہورہے ہیں اور دوسری اقوام کے سامنے مذہب کی غلط اور بگڑی ہوئی تصویر پیش کررہے ہیں۔ایک عورت کی تعلیم ایک خاندان کی تعلیم کا نظریہ غلط ثابت ہورہا ہے۔تعلیم عورت معاشرہ پر بوجھ بن رہی ہے۔ملت کو زیور تعلیم سے سنوارنے کا نظریہ نقصاندہ ثابت ہورہا ہے۔تعلیم یافتہ مسلمان قوم کو دوسرے درجہ کی چیز سمجھ رہا ہے۔غریب،غریب کا دشمن بن رہا ہے۔ہر شخص اپنے سے دولت مند کی طرف مائل نظر آرہا ہے۔غریب ترین خاندان کے نوجوان اپنی خوش نصیبی اور ملت کے دردمند اصحاب کی مدد سے اچھی پوزیشن حاصل کرتے ہی غریب اور غریبوں کو فراموش کررہے ہیں اور ملت کے دوسرے افراد کو کمتر و ناکارہ سمجھ رہے ہیں۔اپنی لڑکی کی شادی کے لئے پاپڑ بیلنے والے اور سماج کو کوسنے والے اشخاص اپنے لڑکوں کے لئے آسمان کو چھونے والے معیارات مقرر کررہے ہیں۔ذاتی مفادات کے لئے مذہب کا سہارا لیا جارہا ہے۔حصول مقصد کے فوری بعد مذہب بیزاری کا مظاہرہ ہورہا ہے۔اساتذہ جن کے ذمہ آنے والی نسلوں کو سنوارنے کی ذمہ داری ہے اپنے پیشہ سے انصاف نہیں کررہے ہیں۔اساتذہ کی بے راہ روی طلباء وطالبات کے کردار کو بھی متاثر کررہی ہے۔چند باروزگار خواتین غلط مثالیں پیش کررہی ہیں۔جن کی وجہ سے پوری قوم بدنامی کا شکار ہورہی ہے۔

ہم نے مرزا کو روک لینا مناسب سمجھا ورنہ ایسا لگ رہا تھا جیسے مرزا نے یہ طئے کرلیا ہو کہ معاشرہ کا مکمل پوسٹ مارٹم کردیا جائے۔ہم نے مرزا کو سمجھایا کہ معاشرہ کے بگاڑ میں ہم خود بھی حصے دار ہیں۔معاشرہ کا ہر فرد اگر باخلوص ہوجائے تب مکمل معاشرہ خود بخود سدھر جائے گا۔ ہر دور میں نئی نسل Generation Gap کا شکار ہورہی ہے اور اس نسل کو قابو میں رکھنے کے لئے بزرگوں اور سرپرستوں کو بہت ہی محتاط رہنا ہے تاکہ یہ نسل بے راہ روی کا شکار نہ ہوجائے اور ملت کی کشتی منجدھار میں نہ پھنس جائے۔ہر دور میں مصلحین قوم کو ان تمام شکایات کا سامنا کرنا پڑا۔مصلحین کی نیک نیتی نے ان کے مشن کو کامیاب کیا اگر آج ہم ہماری نسل پر قابو پانے میں ناکام ہیں تو یہ صرف اور صرف ہماری کوتاہی اور نااہلی کے باعث ہے اسی لئے شاعر مشرق علامہ اقبالؒ نے فرمایا ؎

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

غزل

سر سے دستار گری ہاتھ سے ہتھیار گرے
مصلحت اوڑھ کے جب قوم کے سردار گرے

کشتیِ قوم بھلا پار کہاں سے لگتی؟
موجِ طوفان سے گھبراکے جو پتوار گرے

اور ہوں گے جو ترے در پہ گرا کرتے ہیں
غیر ممکن ہے کہ مجھ سا کوئی خود دار گرے

وہ کہ ہر روز عداوت کی بناء رکھتے ہیں
اپنی کوشش ہے کہ نفرت کی یہ دیوار گرے

ہم تو سمجھتے تھے اٹھانے وہ ہمیں آئیں گے
بس یہی سوچ کے رستے میں کئی بار گرے

جان تھی جب تو کوئی پوچھنے والا بھی نہ تھا
اب میری لاش پہ بیکار عزادار گرے

جھک کے چلنا تو شریعت کا تقاضا ہے مگر
اتنا بھی ٹھیک نہیں جس سے کہ معیار گرے

شوق دنیائے سخن کے کئی استاد سخن
بحر و اوزان میں لنگڑاتے کئی بار گرے

سلیم شوق پورنوی

محفل

محنت و جفاکشی قوموں کی ترقی کی داستان ہو یا کسی فرد کی کامیابی کے قصے سب کے پیچھے چھپا راز انتھک محنت اور مسلسل جدوجہد ہی ہے، کامیابی کی فلک بوس چوٹیوں کو سر کرنے کے لیے صرف محنت اور عزم کا ہی سہارا لیا جاتا ہے۔ کسی بھی میدان میں کامیابی، محنت، دلجمعی اور احساس ذمہ داری کے بغیر ممکن نہیں۔ جتنا عظیم مقصد ہوتا ہے اس کی تکمیل کے لیے اتنی ہی زیادہ محنت درکار ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف انسان فطری طور پر جلد باز ہے اور بہت جلد مایوس ہو کر جدوجہد ترک کر دیتا ہے، انسان کی یہی جلد بازفطرت اسے کوئی بھی کام دلجمعی کے ساتھ نہیں کرنے دیتی۔ جبکہ مسلسل جدوجہد ہی کامیابی کی کلید ہے۔ جہد مسلسل درحقیقت انسانی صبر و تحمل کا امتحان ہوتی ہے، قرانِ پاک نے کسی بھی طرح کی محنت کے لیے ایک بنیادی اُصول مقرر کیا ہے اور یہ ہے کہ ”لیس للانسانِ الاّ ماسعی“ انسان کے لیے اس کے سوا کچھ نہیں جس کی اس نے کوشش کی۔ انسان مسلسل محنت کر سکتا ہے لیکن نتائج کی ذمہ داری اُس کی نہیں ہے۔ اپنے وقت کا ایک عظیم انسان جس نے روشنی کی چکاچوندیوں کی بنیاد رکھی اس کا قول ہے کہ ”میں ناکام نہیں ہوا بلکہ ہزاروں ایسے راستے ڈھونڈ لیے جن پر چل کر کامیابی نہیں مل سکتی۔“ اس نے ایک ایجاد کے لیے ان گنت تجربے کیے، مسلسل جدوجہد اور محنت کے بعد جب اس کو کامیابی ملی تو آج بھی اس کی ایجاد کی روشنی ہماری آنکھوں کو چندھیا رہی ہے۔ تاریخ شاہد ہے دنیا میں ہمیشہ محنتی لوگوں نے ہی ترقی کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا میں ہر چیز کا نعم البدل موجود ہے، لیکن محنت کا کوئی درمیانی راستہ یا کوئی ایسا ”شارٹ کٹ“ ایجاد نہیں ہوا جس پر چل کر بغیر محنت کے کامیابی کا طوق گلے میں ڈال لیا جائے۔ لہٰذا زندگی کے ہر میدان میں قوی قوتِ برداشت، مضبوط قوتِ ارادی، احساسِ ذمہ داری اور پرخلوص محنت ہی انسان کو منزل مقصود تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے اور جب اس محنت کا مقصد رضائے الٰہی اور امت کی سربلندی ہو تو کامیابی کو مزید چار چاند لگ جاتے ہیں۔ چنانچہ دنیا میں سہل پسند، کام چور اور نکمّے لوگوں کے لیے کامیابی کی کسی گاڑی میں کوئی جگہ نہیں ہے، جبکہ محنت سے کام کرنے والوں کے لیے پوری دنیا کے دروازے کھلے پڑے ہیں، لہٰذا اگر آپ محنت اور جدوجہد سے نہ گھبراتے ہوں۔ کام، کام اور صرف کام کے عادی ہوں تو پھر یہ وقت آپ کا ہے، مستقبل آپ کا ہے، کامیابی سے آپ کو کوئی روک نہیں سکتا۔ اپنا مستقبل بھی آپ کے ہاتھ میں ہے، اس معاشرے کی نگاہیں بھی آپ پر لگی ہیں۔ بس ضرورت ہے تو ہمت کی، انتظار ہے تو محنت کی ابتداء کا۔

خاص کام

خاص کتاب

If I Should Speak

یہ اؔم زکیہ کا تحریر کردہ ایک شاندار ناول ہے۔ یہ افسانہ تین طالب علموں کے ارد گرد گھومتا ہے۔ ایک عیسائی (تامیکا) اور دو مسلم (دی اور آمنہ) یہ تینوں ایک ہی روم میٹس تھیں۔ یہ تحریر الگ الگ مذاہب پر عمل کر رہی لوگوں کی عکاسی کرتی ہے۔ تامیکا، دی اور آمنہ کو اسلام کے دو الگ الگ طریقوں پر عمل کرتے ہوئے مشاہدہ کرتی ہے۔ دونوں کو دیکھتے ہوئے تامیکا کا دل اسلام کی طرف مائل ہونے لگتا ہے لیکن اسکا ذہن دو نظریات کے اسلام کو دیکھ کر منتشر ہو جاتا ہے۔ بہرحال آخر میں اسے صحیح راستہ مل جاتا ہے۔ ناول کی مصنفہ ام زکیہ ایک امریکی خاندان میں پیدا ہوئیں۔ انھوں نے ۱۹۹۷ میں ایموری یونیورسٹی سے آرٹس کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اور ایک مصنفہ، استاد، اور اسپیکر کی حیثیت سے مشہور ہوئیں۔ یہ ام زکیہ کا پہلا ناول ہے، جو ۲۰۱۰ء میں شائع ہوا۔ اشاعت کے ساتھ ہی بین الاقوامی توجہ حاصل کر لی اور ریاست ہائے متحدہ کی سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتاب رہی۔ اس کتاب نے نہ صرف یہ کہ بین الاقوامی پروفیسرز اور مصنفین سے داد تحسین حاصل کی بلکہ میگزین اور اخبارات میں بھی توصیفی تبصرہ سے نوازی گئی۔ اس کے بعد اسی سیریز کی دو اور ناول شائع ہوئیں A voice اور Footstep۔ ان کتابوں نے کئی دلوں کو بدل دیا، بہت سے غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا اور کئی مسلمانوں نے اپنی اصلاح کے لئے ترغیب بھی حاصل کی۔

ام رجاء

خاص بات

زبیر اختر

فلسفۂ موت و حیات زندگی اور موت۔۔۔ فلسفہ کہ حقیقت۔۔ لوگوں نے بہت لکھا، پڑھا، سمجھا، سمجھایا۔۔۔ طویل بحثیں ہوئیں۔۔۔ سنجیدہ لوگوں نے فکری مقالے کہے۔۔۔ بے فکروں نے مذاق بنایا۔۔۔ اب نیند نہیں آ رہی تو میں کچھ لکھ لوں۔۔۔ دنیا کی سب سے سنجیدہ حقیقت۔۔۔ یا سن سن کر بور ہو جانے والی بکواس۔۔۔ بے فکروں کا قول کہ۔۔۔ عیش کر دنیا کی غافل زندگانی پھر کہاں؟۔۔۔ سنجیدہ لوگوں کا پیغام کہ جب گہہِ دھوکہ سے قدم باہر نکلے تب معلوم ہو کہ ساری زندگی متاع غرور کے لیے سر پیر مارتے رہے؛ اسلئے ان بے اعتبار لمحات میں جس قدر ہو سکے اپنی کھیتی میں محنت مشقت کرو کہ وقت آنے پر اچھی فصل تیار ملے۔ سائنس میں پڑھا تھا کہ ایک دل ہے جو دھڑکتا رہتا ہے، ایک نظام ہے عمل تنفس کہ سانس آتی جاتی رہتی ہے۔۔۔ بس یہی ہے زندگی اور موت۔۔۔ جب تک دھڑکن اور تنفس کا عمل جاری ہے اہل جہاں کی ذمہ داری ہے، نہ کوئی نوری ہے نہ کوئی ناری ہے، فلاں چیز ہماری ہے بقیہ چیز تمہاری ہے۔۔۔ حالاتِ زمانہ، اعمالِ روزانہ، خوشی، غمی، مصائب و تکالیف، عیش و نشاط، یادِ ماضی، سعیٔ حال، فکر مستقبل۔۔۔ مرادیں، منتیں، دعائیں، محنتیں، مبارکبادیں، طعنے، جھڑکیاں، نصیحتیں، عبادتیں، عیادتیں، تسلیاں اور تلقینِ صبر۔۔۔ جہاں سانس تھم گئی۔۔۔ دھڑکنیں رک گئیں، چند لمحوں کی تجہیز و تکفین اور کچھ دنوں تک تذکرے۔۔۔ یک لخت سب کچھ ختم، لوگوں سے آپ کی یا آپ کی لوگوں سے امیدیں، کوششیں، تکمیلِ فرائض کہ ادائیگی حقوق، اب تک کی زندگی اور آئندہ کے منصوبے۔۔۔ سب کے سب پیوندِ خاک۔ کچھ سمجھے حضرت۔۔۔؟ یہی زندگی ہے، یہی موت ہے اور یہی زندگی اور موت کا فلسفہ۔۔ اس لیے اب کوئی خبر لے یا خیریت پوچھے تو جواب یہ کہ۔۔۔ زندہ ہوں اور جس دن جواب باطل ہوا تو یہ شعر مخاطب رہے گا

وقفہِ سکون ملا، قبر کی آغوش میں حرّ زنداں ہوئے، دنیا سے سبکدوش ہوئے

ابن ماجد
جہاز رانی کے ماہر
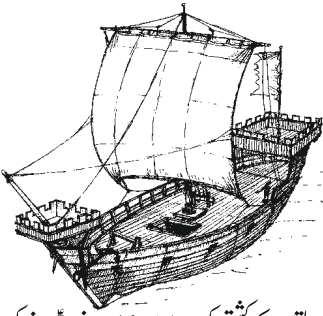
از: عبدالحکیم قمر نظام آباد، تلنگانہ

سمندروں میں جہاز رانی کے فن میں مہارت کا سہرا ہمیشہ مسلمانوں کے سر رہا ہے کیونکہ قرآن کے ذریعہ ہمیں پتہ چلتا ہے کہ کشتی کی ایجاد ہی حضرت نوحؑ نے کی تھی اور تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت داؤدؑ نے اس میں مقناطیس لگایا تھا یعنی قطب نما جو سمندر میں ہمیں شمال اور جنوب کی سمت بتلاتا ہے اور جہاد میں سوار مسافر و جہاز راں اپنے سفر کو آسانی سے طئے کر پاتے ہیں۔ اس کے علاوہ عرب کے تاجر سمندری راستوں کے ذریعہ تجارتی مال ایک مقام سے دوسرے مقام منتقل کرتے تھے اور ان ہی سمندری راستوں کے ذریعہ مبلغین ہمارے ملک بھی تشریف لائے اور ہم تک دین اسلام کی عظیم نعمت پہنچی ہے۔

عربوں نے سمندری سفر کو آسان بنانے کیلئے اسکے اصول وضوابط اور مختلف سہولیات فراہم کی۔ ان عرب سیاحوں میں ایک نام ''ابن ماجد'' کا ہمیں ملتا ہے جس کو ملاحوں کی زبان میں ''شیخ ماجد'' کہا جاتا ہے۔

ابن ماجد کا نام شہاب الدین احمد تھا ان کا تعلق علاقے نجد سے تھا ان کے دادا بھی جہاز رانی کے معلم تھے۔ ابن ماجد کو بحر ہند، بحر احمر کے بارے میں اس قدر معلومات اور تجربہ تھا کہ قرون وسطیٰ کے جہاز رانوں میں کوئی بھی ان سے سبقت نہ لے جاسکا۔ انہوں نے ایک کتاب 'الفوائد فی اصول علم البحر والقواعد' لکھی جس میں انہوں نے بحر ہند کے سمندری راستہ، مغربی بحر چین کی کچھ بندرگاہوں کے عرض بلد، خشکی کے قریب ہونے کے علامات، جزیرہ نمائے عرب اور دیگر جزائر پر مفید معلومات فراہم کی۔ اس کے علاوہ انہوں نے اس کتاب میں سمندری سفر کیلئے موسمی ہوائیں، لنگر اندازی کے طریقے اور پانی میں ڈوبی ہوئی یا نکلی ہوئی چٹانوں کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔

ابن ماجد کی یہ کتاب ملاحوں کیلئے گائیڈ کا کام کرتی ہے۔ فرانسیسی فرد (Gabriel Ferrand) نے اس کتاب کے بارے میں لکھا ہے کہ ''یہ کتاب جہاز رانی اور بحری علوم کا خوب صورت مجموعہ ہے اور اس میں قرون وسطیٰ کے آخری دور کے تمام علوم کو سمو یا گیا ہے۔''

ابن ماجد ایک عمدہ شاعر بھی تھے ان کی بیشتر تصنیفات شاعری میں ہی ہیں ان کی لکھی کتابوں کی تعداد 35 تک ہے واسکوڈی گاما کو ہر بچہ اچھی طریقہ سے جانتا ہے اور اپنی سماجی علوم کی کتاب میں پڑھتا بھی ہے کہ وہ ہندوستان کے ساحل پر سب سے پہلے سمندری راستہ سے آیا تھا لیکن بچو آپ کو جان کر حیرت ہوگی کہ ''واسکوڈی گاما کو ہندوستان کا راستہ ابن ماجد نے ہی بتلایا تھا اس بات کی تصدیق قطب الدین یزدانی نے اپنی کتاب 'البرق الیمانی فی الفتح العثمانی' میں کی ہے۔'' عزیز بچوں ہر ماہ ہم کسی نہ کسی مسلم سائنسداں کے بارے میں معلومات حاصل کرتے رہتے ہیں لیکن ان تمام تحریروں سے ہمیں جو سبق ملتا ہے وہ یہ ہے کہ ہم بھی سائنس کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیں اور غور وفکر سے کام لیں۔ اکثر طلباء تعلیم کو روزگار کمانے کا ذریعہ سمجھتے ہیں لیکن تعلیم کا مقصد اللہ کی ذات کو پہچاننا اور اس نے اس کائنات، زمین اور اپنے جسم میں جو نعمتیں رکھی ہیں اس پر غور وفکر کرتے ہوئے اللہ کے آگے جھک جانے کا نام ہی علم ہے۔ لہٰذا ابن ماجد کی طرح ہمیں بھی تحقیق وجستجو کرتے ہوئے انسانیت کے لئے کچھ ایسے کام کرنے ہونگے جو ہمارے لئے ثواب جاریہ بن جائے۔

اُمید

لقمان حارث

امید بھی کچھ باقی ہے اک بستی بسنے والی ہے
جس بستی میں کوئی ظلم نہ ہو
اور جینا بھی کوئی جرم نہ ہو
وہاں پھول خوشی کے کھلتے ہو
اُمید ہے ایسی بستی کی
جہاں جھوٹ کا کاروبار نہ ہو
وہاں خون کی ہولی عام نہ ہو
اس آنگن میں غم کی شام نہ ہو
جہاں صنف کو انصاف ملے
دل سب کا سب سے صاف ملے
بس ایک ایسی بستی ہو
جہاں روٹی زہر سے سستی ہو

خاموشی

خاموشی قلعہ ہے مومنوں کا
خاموشی شیوہ ہے عاجزوں کا
خاموشی دبدبہ ہے حاکموں کا
خاموشی جواب ہے جاہلوں کا

عبدالوہاب، نوی پیٹھ

ایک بھکاری کی لاٹری نکل آئی تو اس نے مسجد بنوائی۔
دوسرا بھکاری: تو نے مسجد کیوں بنوائی۔؟
بھکاری: اس کے سامنے اب میں اکیلا ہی بھیک مانگا کروں گا۔

مرزا کامران بیگ

باپ: بیٹا! اس بار امتحان میں تمہیں 90% نمبر لینے ہیں۔
بیٹا: نہیں ابو! اس بار تو میں پورے 100% لوں گا۔
باپ: مذاق کیوں کر رہے ہو۔؟
بیٹا: شروع کس نے کیا تھا۔

راحیل انور، شیخا پور

ایس آئی او نے طلباء برادری سے ایس ایس سی گھوٹالے کے خلاف آواز اٹھانے کی اپیل کی

نئی دہلی، سی جی او کامپلیکس میں اسٹاف سلیکشن کمیشن آفس کے باہر احتجاج کر رہے طلباء سے ملاقات کے بعد صدر تنظیم ایس آئی او آف انڈیا برادر نحاس مالا نے کہا کہ اس معاملے میں سی بی آئی کو فوری طور پر کوئی قدم اٹھانا چاہیے، بجائے اس کے کہ امتحان کو دوبارہ منعقد کر کے معاملے کا رخ موڑ دیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ ہم ان طلباء کے ساتھ مضبوطی سے کھڑے ہیں جو اپنے حقوق کا مطالبہ کر رہے ہیں اور اس سسٹم کو ایسے لوگوں سے بچانے کی کوشش کر رہے ہیں جو پیپر لیک کرنے میں شامل تھے۔ ہم سی بی آئی سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ اس معاملے کی اچھی طرح تحقیق ہونی چاہیے اور قصورواروں کو سزا ملنی چاہیے جنھوں نے ہزاروں طلباء کا مستقبل خراب کیا ہے۔ ایس آئی او پورے ملک کی طلبہ برادری سے اپیل کرتی ہے کہ وہ ایس ایس سی کے اس منصوبہ بند گھوٹالے کے خلاف آواز اٹھائیں اور ایسے نازک وقت میں ان طلبہ کے ساتھ کھڑے ہوں جو اپنے حقوق کی لڑائی لڑ رہے ہیں۔

ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف سوشل سائنسز میں ایس آئی او طلباء کے ساتھ

ممبئی، ایس آئی او آف انڈیا، ٹاٹا انسٹیٹیوٹ آف سوشل سائنسز انتظامیہ کی جانب سے کمزور طبقات سے آنے والے طلباء کی اسکالرشپ اور دیگر مالی امداد روکنے کی شدید مذمت کرتی ہے۔ انسٹی ٹیوٹ انتظامیہ گزشتہ سال 2015 میں بھی او بی سی طبقہ سے آنے والے طلباء کو دی جانے والی امداد روک چکا ہے۔ حال ہی میں انتظامیہ کی جانب سے ایس سی اور ایس ٹی طبقے سے آنے والے طلبہ کو دی جانے والی مالی امداد روکنا انہیں مالی طور پر اور کمزور بنانے کا ہتھکنڈا ہے۔ انتظامیہ کی جانب سے فیس میں بڑھوتری طلباء کو اعلیٰ تعلیم سے محروم رکھنے کا ایک ذریعہ ہے۔

ہندوستان میں تعلیمی نظام کی تاریخ دیکھیں تو پتا چلتا ہے کہ یہ ہمیشہ اعلیٰ طبقات خاص طور پر برہمنوں کے ہاتھوں میں رہی ہے۔ تاریخ یہی بتاتی ہے کہ تعلیم پر صرف ان کا حق ہے جو سماجی اور مالی طور پر مضبوط ہیں۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کس طرح کمزور طبقات سے آنے والے طلباء کو تعلیم حاصل کرنے سے روکا گیا اور ان پر مظالم ڈھائے گئے۔ موجودہ دور میں بھی ہندوستان کے اعلیٰ تعلیمی ادارے براہمنوں کے ''اگرہارہ'' بنائے جا رہے ہیں۔ جب کمزور اور نچلے طبقات سے آنے والے طلبہ نے ان اداروں میں داخلہ لینا شروع کیا تو پالیسیوں اور قوانین میں چھوٹی لیکن اہم تبدیلیاں کر کے حکومتوں نے انہیں اعلیٰ تعلیم سے دور رکھنے کے لئے ممکنہ اقدامات کیے۔ جن میں اسکالرشپ اور مالی امداد جیسی پالیسیاں اہم ہیں۔ 2014 میں مرکزی اقتدار میں آئی بی جے پی حکومت نے تعلیم کا پرائیویٹائزیشن تیزی کے ساتھ کر کے اس جانب ایک اور قدم بڑھایا۔ ملک کے تقریباً سبھی اعلیٰ تعلیمی اداروں میں اچانک سے ہوئی فیس بڑھوتری، اسکالرشپ اور مالی امداد میں کٹوتی ایسے اقدام ہیں جن کے ذریعہ حکومت کمزور اور نچلے طبقات سے آنے والے طلبہ کو اعلیٰ تعلیم سے محروم رکھنا چاہتی ہے تاکہ تعلیمی اداروں کے دروازے ان کے لئے بند ہو جائیں اور وہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد حکومت کی پالیسیوں اور منصوبہ بندیوں پر سوال نہ اٹھا سکیں۔ یہ چھوٹی مگر بہت ہی اہم تبدیلیاں ملک کے تعلیمی اداروں کو ایک بار پھر براہمنوں کے ''اگرہارہ'' میں تبدیل کر دیں گی۔

ایسی صورتحال میں ایس آئی او آف انڈیا ٹاٹا انسٹیٹیوٹ آف سوشل سائنس کے طلباء کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑی ہے جو تعلیمی اداروں پر ان حکومتی حملوں کے خلاف مظاہرے کر رہے ہیں۔ ایس آئی او انتظامیہ کے اس بیان کی بھی شدید مذمت کرتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ تبدیلیاں طلبہ کے حق میں بہتر ہیں۔ ایس آئی او ملک بھر کی طلباء برادری سے اپیل کرتی ہے کہ ایسے نازک دور میں جدوجہد کر رہے ان طلباء کے ساتھ کھڑے ہوں اور حق کی آواز بلند کریں۔

ایس آئی او افلو (EFLU) انتظامیہ کے طلبہ مخالف اقدام کی مخالفت کرتی ہے

اشفاق علی ایک پارٹ ٹائم طالب علم کا کیمپس میں داخلہ بغیر کسی مناسب وجہ کے روک دینا افلو انتظامیہ کا اپنے ہی طالب علم کے خلاف ایک سخت اور نازیبا رویہ ہے۔ یہ گزشتہ تین سال میں ہوئے اسی طرح کے پرتشدد واقعات میں سے ایک ہے، جس میں نوذہین طلبہ افلو انتظامیہ کا نشانہ بنے اور ان کے اعلیٰ تعلیم کے مواقع کو مختلف طریقوں سے روک دیا گیا۔ بعض طلباء ایڈمیشن، داخلے کے ضوابط پر عمل کرنے اور داخلے کے لیے منتخب ہو جانے کے باوجود روک دیے گئے اور بعض کے داخلہ امتحان کے لیے جاری اجازت نامے بھی روک دیے گئے۔ طلباء کے خلاف اس طرح کے عجیب وغریب اقدامات سابق وائس چانسلر اور پراکٹر کے ذریعہ کیے جا رہے ہیں۔

اشفاق سکیورٹی اسٹاف سے کیمپس میں اپنے داخلے پر پابندی کے سلسلے میں جانکاری لینے آیا تھا، اس سے صحیح طریقے سے گفتگو بھی نہیں کی گئی اور پراکٹر نے اس سے ملنے سے انکار کر دیا۔ یہ واضح طور پر کچھ طلبہ کے خلاف منظم اور نشان زد حملہ ہے۔ اس معاملے کی سنجیدگی کا اندازہ اس حقیقت سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ان میں سے زیادہ تر طلبہ دلت، مسلم طبقے سے متعلق تھے اور سیاسی طور پر متحرک تھے۔ ایس آئی او کے قومی صدر نحاس مالا نے کہا کہ ایس آئی او طلباء کے خلاف افلو انتظامیہ کے نازیبا رویے کی مذمت کرتی ہے۔ ایس آئی او پرزور مطالبہ کرتی ہے کہ طلباء کی شکایتوں کی جلد از جلد تلافی کی جائے ورنہ ایس آئی او قانونی لڑائی کے ساتھ ساتھ ایک عوامی مہم کا آغاز کرے گی۔